

ماہنامہ

براہین

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ

ارٹو گراف

عظمت اللہ والرحمن والرحیم

toobaa-elibrary.blogspot.com

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ

ماہنامہ

سراہین

شاہ ولی اللہ نمبر

اپڈیٹ

عظمت اور الجھن وانی

toobaa-elibrary.blogspot.com

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

ماہنامہ

براہین

ایڈیٹر

عطاء الرحمن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی

سرپرست:

ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی (سابق گورنر ہریانہ)

مجلس ادارت

مولانا جنید احمد بنارس
اسامہ خالدی
عطاء الرحمن قاسمی (مدیر)

محمد ادیب
فیضی عزیز ہاشمی
وسیم احمد سعید

فہرست مضامین

- | | | |
|----|-------------------------------|---|
| ۳ | مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی | شاہ ولی اللہ خصوصی شمارہ |
| ۵ | مولانا مسعود عالم ندوی | امام ولی اللہ دہلوی سے پہلے اسلامی ہند کی دینی حالت اور تدریجی ارتقاء |
| ۲۱ | مولانا علامہ سید سلیمان ندوی | ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال کا سبب |
| ۲۳ | مولانا سعید احمد اکبر آبادی | انقلابی یا مجبور |
| ۲۸ | مولانا حفظ الرحمن سہاروی | حضرت شاہ ولی اللہ کا ایک خاص نظریہ |
| ۳۷ | مولانا محمد یوسف بنوری | امام شاہ ولی اللہ اور حقیقت |
| ۴۵ | مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی | شاہ ولی اللہ دہلوی |
| ۵۵ | مولانا ابوالحسن علی ندوی | حضرت شاہ ولی اللہ بحیثیت مصنف |
| ۶۱ | مولانا محمد اویس ندوی نگرانی | شاہ صاحب کا ایک علمی ماخذ |
| ۶۵ | مولانا سید ابوالنظر امرہوی | شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی بعض علمی خصوصیات |
| ۶۹ | ڈاکٹر اسرار احمد | اسلام برعظیم پاک و ہند میں حضرت شاہ ولی اللہ کے حوالے سے |

شاہ ولی اللہ خصوصی شمارہ

مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی

حضرت شاہ صاحب اپنے دور کے شاہی نظام کو دیرپا خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آئندہ ملک میں شاہی نظام کے بجائے کوئی اور ہی نظام ہوگا جو جمہوریت کا رنگ و روپ اختیار کئے ہوئے ہوگا۔

آپ نے امت کے مختلف طبقات سے خطاب کیا ہے اور ان کے اخلاقی و روحانی امراض کی نشاندہی کی ہے۔ آپ کے کل معرکتہ الراء خطابات آپ کی بعض کتابوں میں موجود ہیں۔ خاص طور پر تفہیمات الہیہ میں آپ کے خطابات کا معتمد بہ حصہ موجود ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں معاشرہ کے زوال و انحطاط کے اسباب و علل پر بھی خاص گفتگو کی ہے۔ یہ حصہ دوسرے حصوں کی طرح لائق مطالعہ ہے۔

حضرت شاہ صاحب باوجود اس کے احسانی تصوف کے نہ صرف قائل تھے۔ بلکہ روحانی پیشوا و شیخ طریقت بھی تھے اس کے باوجود اپنے زمانہ کے نام نہاد صوفیوں و مشائخ کے غیر اسلامی طریقہ ہائے زندگی اور ان کے گنہگار معاش کے ذرائع کے بھی سخت خلاف تھے۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے مقاصد میں ایک اہم ترین حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیفات و تالیفات خواہ قدیم مطبوعات ہوں، یا خواہ مخطوطات ہوں ان کو از سر نو معیار و اعتبار کے ساتھ شائع کرنا ہے۔ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ اپنے قیام کے مقاصد

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سترہویں صدی کے جلیل القدر عالم دین، محدث، مفسر، فقیہ، فلسفی اور ماہر اقتصادیات تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا دور گرجہ سیاسی و معاشی اعتبار سے زوال و انحطاط کا عہد تھا لیکن آپ کی سوچ و فکر پر زوال وادبار کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ جو کچھ سوچتے اور لکھتے تھے اس سے واضح طور پر محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک پرامن ماحول میں بیٹھ کر اپنے فکر و فلسفہ کو سپرد قلم و قلم کر رہے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کے علمی و فکری کاموں کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ انہوں نے تطبیق بین الفقہ و الحدیث کی بھی کوشش کی۔ اور وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود کے مسئلے کو بھی حل کرنے کا عزم کیا اور اجتہاد و تقلید کے مابین نقطہ اعتدال کی راہ تلاش کرنے کی سعی مشکور بھی کی ہے۔

ان کے ان اجتہادی کاموں کو دیکھتے ہوئے مجدد وقت کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ حضرت شاہ کی تصنیفات و تالیفات کا معروضی مطالعہ کیا جائے تو حضرت شاہ صاحب مختلف حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب ماہر اقتصادیات بھی تھے۔ آپ کا اقتصادی نظریہ کا محور محض معدہ تک محدود نہ تھا بلکہ روحانی پہلو بھی ہر لمحہ ملحوظ خاطر رہتا تھا۔

وہ تقسیم دولت میں توازن و اعتدال کے قائل تھے، ان کا خیال تھا جب دولت ایک طبقہ میں محدود ہو جاتی ہے تو معاشرہ تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے۔

وتفتیش شروع کی تو علمائے قدیم اور معاصرین کے طویل سے طویل تر مضامین ملے۔

مولانا عبید اللہ سندھی کا مقالہ بہت ہی طویل تھا، یہ مقالہ سوڈھیز سو صفحات پر مشتمل تھا مولانا عبید اللہ سندھی نے ہی عالم اسلام میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا تعارف کرایا تھا۔ ورنہ لوگ حضرت شاہ صاحب کو بھاری پتھر سمجھ کر اور چھو کر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ مولانا سندھی مرحوم دورانِ جلا وطنی حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم و فنون کا تعارف کراتے رہے ہیں۔ مولانا سندھی ہی تفہیمات المصیبات کا مخطوطہ روس سے لائے تھے اور ڈاکٹر ذیل گجرات سے شائع کرائے تھے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کا مقالہ بھی خاصا طویل تھا۔ اس کو کتابی شکل میں شائع کیا جاسکتا تھا۔ اس خصوصی شمارہ میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ۲۰۰ سے زائد صفحات پر محیط مقالہ کو شائع کیا جاسکے۔

طے کیا گیا کہ مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے مقالوں کو بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

سر دست مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا یوسف بنوری، مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہا روہی، مولانا محمد اویس نگرانی اور ڈاکٹر اسرار احمد وغیرہ کے مقالات کو شائع کیا جائے اور یہ مقالات مختلف مجلات و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں ان میں اکثر مضامین ماہنامہ الفرقان میں شائع ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا قیمتی مقالہ حکمت قرآن لاہور میں شائع ہوا ہے۔ میں ان تمام مقالوں نگاروں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اذکار و نظریات کی ترویج و تشریح میں مخلصانہ سعی کی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

اس سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے ان تمام مقالوں کو آئندہ خصوصی شمارہ میں شائع کیا جائے گا اور علمی و ادبی حلقوں میں پہنچانے کی سعی کی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

کے مطابق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی عربی، فارسی کتابوں، ترجمہ و اشاعت کی ذمہ داری بحسن و خوبی انجام دے رہا ہے۔ الحمد للہ جمعرات، طبعات، لمعات، الخیر الکثیر اور الجز اللطیف فی ترجمہ العبد الضعیف وغیرہ کتابوں کو کلیات شاہ ولی اللہ کی صورت میں جمع و مدون کر دیا گیا ہے۔ اور ان کتابوں کے اردو تراجم مع حواشی شائع کرنے کا منصوبہ ہے۔ انسٹی ٹیوٹ ان کو جلد ہی شائع کرنے کا اہتمام کرے گا۔ اس کے بعد فقہ سے متعلق تمام رسائل اور کتابچوں کو مع تراجم ”کلیات شاہ ولی اللہ“ کے نام سے شائع کیا جائے گا۔ علی الترتیب تفسیر، حدیث اور دوسرے علوم و فنون پر لکھی گئی کتابوں کو بھی کلیات کی شکل میں شائع کیا جائے گا۔

متون اور تراجم کی صحت و درستگی کا بھرپور اہتمام کیا جائے گا۔ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے سامنے یہ منصوبہ بھی زیر غور ہے کہ ترجمہ فتح الرحمن کو بھی شائع کیا جائے۔ لیکن وسائل کے فقدان کی وجہ سے اس کی ہمت نہیں ہو پارہی ہے۔ حالانکہ یہ ایک اہم کام ہے۔ حضرت شاہ صاحب کا فارسی ترجمہ پاکستان اور ایران میں شائع ہوا ہے۔ مجھے بعض اہل علم نے بتایا ہے کہ حال ہی میں فتح الرحمن کو بڑے اہتمام کے ساتھ ایران میں شائع کیا گیا ہے۔ اور اس کا ایک نسخہ پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی صاحب کے پاس موجود ہے۔

علاوہ ازیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تہہ دار اور ہمہ گیر جہت شخصیت کے مختلف گوشوں و پہلوؤں پر مختلف اصحاب قلم اور علمائے دین کی گرانقدر تحریروں اور نگارشات کی اشاعت و ترویج بھی ہے۔ عربی و فارسی اور اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقاء میں حضرت شاہ صاحب کا نمایاں حصہ رہا ہے۔

اس اہم موضوع پر ۲۸/۲۹/۳۰ اپریل ۲۰۱۱ء کو ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار ہونے والا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے طے کیا گیا ہے کہ اس موقع پر ایک یادگاری شمارہ شائع کیا جائے۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث کی شخصیت اور ان کی خدمات پر لکھے ہوئے مضامین کو نہایت اہتمام و انتظام کے ساتھ شائع کیا جائے۔ جب اس پر تحقیق

امام ولی اللہ دہلوی سے پہلے اسلامی ہند کی دینی حالت اور تدریجی ارتقاء

مولانا مسعود عالم ندوی

میں نہ ابو عبیدہ کی تڑپ تھی اور نہ ان کے فرمان رواؤں میں عمر فاروقؓ کا ولولہ جہاد۔ ذرہ خیبر کی راہ سے سب سے پہلا داخل ہونے والا جرنیل محمود غزنوی تھا اس کی سپاہ کا بھی یہی حال تھا اکثر نو مسلم تھے، یہی نہیں بلکہ اس کی فوج میں ہندو سپاہی بھی تھے۔ (۳)

مغل تو محمود کے حملہ کے وقت اسلام بھی نہیں لائے تھے، علاؤ الدین خلجی (۶۹۵-۷۱۶ ہجری) کے زمانہ تک ان کا شمار کفار میں تھا، یہی حال اکثر افغانی قبائل کا تھا، محمود غزنوی کے عہد تک وہ حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئے تھے۔ اہل غور بھی بیشتر چوتھی صدی ہجری میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ یہ تو ان فاتح تو موموں کے اسلام کا حال تھا، اب اسلامی تربیت اور زندگی کو لیجئے ان کی آبادیوں میں محمود غزنوی (۳۸۸-۴۲۱ ہجری) سے پہلے مدرسوں کا رواج نہ تھا۔ دوسرے ذریعوں سے بھی اسلامی تعلیمات عام نہ ہو سکتی تھیں، پھر ان سے یہ توقع کیسے ہوتی کہ ان کے زیر سایہ ہندوستان میں دین حنیف کی اصلی تعلیم پھیلے گی اور صحیح اسلامی حکومت کے قانون جاری ہوں گے؟ نہ یہ توقع ہو سکتی تھی اور نہ ایسا ہوا، ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض نامور بادشاہ ایک طرف تو غیر مسلموں پر جزیہ عائد کرتے ہیں اور دوسری جانب ان کے عبادت خانوں کے انہدام سے بھی دریغ نہیں کرتے، یہی نہیں، بلکہ ان مسلمان نامی مغل فاتحین میں سے بعض ہندو مسلمانوں دونوں کو یکساں موت کے گھاٹ اتارنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ تیمور اور نادر کے حالات کچھ ڈھکے چھپے نہیں۔ ابن بطوطہ (ج ۳ ص ۱۷ مطبوعہ بیروت) کا بیان ملاحظہ ہو۔

ہندوستان پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام کی روشنی سے جگمگا چکا تھا اور یہ سرزمین صحابہ و تابعین کے بابرکت قدم سے یکسر محروم نہ رہی تھی (۱)۔ پر یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلام کی پہلی کرنیں سندھ کے ریگستان سے آگے نہ بڑھ سکیں، اسی طرح عرب تاجر اور جہاز راں، جو مغربی ساحل سے گزر کر سیلون اور جنوبی ہند کے دوسرے جزیروں کا رخ کرتے تھے، ملک کے اندرونی علاقوں میں کم آئے اور اسی لئے ان کا حلقہ فیض ساحلی علاقوں (مالابار اور اس کے آس پاس کے خطے) تک محدود رہا۔ (۲)

عرب اور مغل فاتحین کا فرق

اس ملک اور خاص کر شمالی خطے کی انتہائی بدبختی یہ ہوئی کہ یہ عرب فاتحین کے فیض سے تقریباً محروم رہا، اور ان کے بدلے ترکوں، مغلوں کی غیر اسلامی حکومت اس کے حصہ میں آئی، حالت یہ تھی کہ درہ خیبر سے آنے والے سپاہی اور جرنیل اسلام کی خوبیوں سے بالکل ناواقف تھے، ان کے رگ و پے میں ابھی دین حنیف کی سچائیاں سرایت نہ کر سکی تھیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں وہ اسلامی رنگ، جسے آج کل کلچر کہتے ہیں، بالکل نہ رچ سکا تھا یہ اسلام بھی ایسے وقت (تیسری صدی ہجری کے بعد) لائے، جب خود اسلامی مرکزوں (حجاز، عراق، شام) میں انحطاط کا آغاز ہو چکا تھا اور عباسی خلافت ترکوں کے ہاتھ میں کھلونا بن گئی تھی، یہ سب سالار اکثر ترک غلام تھے جن کے کان اسلام کے قانون جنگ سے یکسر نا آشنا تھے، ان کی فوج کے سپاہی، مال اور لوٹ کے لالچ میں چلے آئے تھے، ان کے دلوں

کی ہے تو اس سے زیادہ وہ خود یہاں کے تمدن اور مذہب سے متاثر ہوا ہے۔ (تمدن ہند ص ۷۵۵)

”ہندوان سے اس قدر متاثر نہیں ہوئے جتنا یہ ہندو سے۔“

(ص ۱۳۵)

زیادہ تفصیل کا موقع نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ گو اسلام کے اس دلیس پر ہزاروں احسان ہیں اور اس کی روشن تعلیمات کے اثر سے یہاں کے مذاہب میں تبدیلیاں اور اصلاحات ہوئی ہیں تاہم درحقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ہندوستان میں اسلام جتنا بھی موثر ہو سکا اس سے زیادہ متاثر ہوا

ہے اور یہاں مسلمانوں نے جو زبان، تہذیب، لباس اختیار کئے وہ سب ہندوانہ ہیں، یا ہندو مسلمانوں کے امتزاج کا نتیجہ اور یہ سچ میل ہندوانہ تہذیب اور مخون مرکب مذہب عوام تو عوام علماء اور صوفیوں کے دل و دماغ پر کچھ ایسا چھا گیا، کہ حضرت مجدد ہندی (۹۷۱-۱۰۳۴ء) سے لے کر آج تک تین سو سال سے کچھ اوپر کی مسلسل اصلاحی کوششوں کے بعد بھی یہ صدیوں کا پیٹھا ہوا رنگ دور نہیں ہو سکا ہے اور اللہ جانے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے سچے دین کی اصلی تعلیمات یہاں اپنے سادہ اور اصلی رنگ میں کبھی جلوہ گر ہو بھی سکیں گی یا نہیں؟

دسویں صدی ہجری سے پہلے

یہ ہندوانہ اسلام اور تصوف و ویدانت سے مرکب مذہب تو ہر دور میں دماغوں پر مستولی رہا ہے، پر دسویں صدی ہجری سے پہلے کفر و شرک کی یہ اندھیاری اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی اور گجرات و سندھ کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر جن کے تعلقات عربی ملکوں سے زندہ تھے، صحیح اسلام کی روشنی کہیں دکھائی نہیں پڑتی تھی، جدھر نگاہ اٹھاؤ، ایرانی ہندی تصوف، حلول، بروز، اور وحدۃ الوجود (۴) کے عقیدے سے اعمال ہندوانہ اور مشرکانہ، گھر قرآن و حدیث سے خالی اور کتاب و سنت کے چشمہ صافی سے پیاس بجھانے والوں کا عام قوط۔

ان بت پرستانہ عقیدوں اور بدعات کے رواج کے سب سے بڑی وجہ قرآن و حدیث کا جہل ہے وہ کتاب جو خلق کی ہدایت اور تذکیر کے لئے اتری تھی، قبروں پر قرآن خوانی کے لئے وقف کر دی گئی، اور سنت کا

”ہرات کے آس پاس کے رہنے والے بڑے بہادر ہیں، اہل ہند پر برابر دھاوا بولتے ہیں۔ اور بسا اوقات مسلمان عورتوں کو بھی لوٹنیاں بنا کر لے آتے ہیں الخ“

Bhatnir کو بچانے کے لئے مسلمان راجپوتوں کے دوش بدوش دل کھول کر صرف لڑے ہی نہیں بلکہ جب فتح کی امیدیں جاتی رہیں، تو راجپوتوں کی طرح وہ بھی اپنی بی بیوں، بچوں کو تہ تیغ کر کے جان دینے کے لئے میدان میں آگئے۔

Studies in Indian History By - S.N. Sen P115

ہندوستان میں اسلام کی عام حالت

پس آپ نے دیکھا کہ اس ملک کی قسمت میں اسلام کے ایسے پیامبر تھے، جو اس کے احکام سے بھی صحیح طور پر واقف نہ تھے، اور اگر تھوڑی بہت واقفیت تھی تو اسپر عامل نہیں تھے، نتیجہ ظاہر ہے بھارت کی سرزمین میں، حجاز سے نکلے ہوئے نکھرے تو حیدی مذہب کی مٹی پلید ہو گئی۔ اللہ کی کتاب عربی زبان میں تھی اور یہ خدا کے بندے فارسی لکھتے بولتے تھے، عربی سے دور کا لگاؤ بھی نہیں تھا نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب اللہ تو طاق نسیاں کی زینت بن گئی اور دین تو حید ہندوانہ آلودگیوں میں بہت پت ہو گیا، اللہ کی کتاب جب سامنے نہ ہو تو پھر ہندوانہ عقیدوں اور ویدانت کی دوراز کار موشگافیوں کا اسلامی عقائد میں گھل مل جانا کیا تعجب کی بات ہے؟ سچی بات یہ ہے کہ محمد بن عبداللہ (مقدی بابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے دین کی جو بری گت اس ہندوستان میں بنی، شاید دنیا کے کسی خطہ میں ایسا نہ ہوا ہو، ہندوستانی اسلام کی اس بد حالی پر اپنے تو اپنے، غیر بھی طعنہ زن ہیں، عبرت کے لئے ایک دو شہادتیں سن لیجئے۔

”ہندوستانی اسلام کا مطالعہ کرتے وقت، ایک محقق کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اس مذہب کی بری طرح مٹی پلید ہوئی ہے،“ (تمدن ہند (فرنج میں) از لوبون، اردو ترجمہ ص

(۳۱۰)

”اگر ہندوستان میں دین محمدی نے اپنے کچھ اثرات چھوڑے ہیں اور یہاں کے مذہب اور عقائد میں کچھ تبدیلی

”اس حدیث سے تو شافعی استدلال کرتے ہیں اور وہ ہمارے مذہب کے دشمن ہیں۔“

اس سے حدیث کی وقعت کا اندازہ ہوگا، اب ذرا وہ ”حدیث“ (؟) بھی سن لیجئے جو بقول فرشتہ، موقع استدلال میں لائی گئی تھی، بیان اس طرح آتا ہے۔

”قاضی رکن الدین شیخ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا ”سماع اور غناء“ کے جواز پر آپ کی دلیل کیا ہے؟“ شیخ نے اس حدیث (؟) سے استدلال کیا ”السماع مباح لابلہ“ (۵) قاضی بولے: ”آپ کو حدیث سے کیا تعلق؟“ آپ تو امام ابوحنیفہ کے مقلد ہیں، اپنے امام کا کوئی قول پیش کیجئے تو ہم اسے دیکھیں، شیخ کا ارشاد ہوا۔ ”بندۂ خدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتا ہوں اور آپ امام ابوحنیفہ کا قول چاہتے ہیں“ (۶)

علاء الدین خلجی (۶۹۵-۷۱۶ھ) کے دور کا ایک عبرتناک سانحہ بھی گوش گزار کر دیا جائے تو اچھا ہو، مصر سے ایک محدث شمس الدین ترک حدیث کی ترویج اور تبلیغ کے دھن میں ہندوستان تشریف لائے، کہا جاتا ہے کہ وہ اسی غرض سے حدیث و متعلقات کی کوئی چار سو کتابیں اپنے ساتھ لائے تھے ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک جامع شرح لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کریں پر ابھی وہ ملتان ہی تک پہنچے تھے کہ انھیں معلوم ہوا کہ ”بادشاہ نماز پنجگانہ کا پابند نہیں اور نہ جمعہ جماعت کا اسے خیال ہے“ رنجیدہ ہوئے اور اٹلے پاؤں لوٹ گئے۔

بعض مصلحین

دسویں صدی ہجری سے پہلے کی زبوں حالی پر بہت کچھ مسالہ فراہم کیا جاسکتا ہے اندازہ کے لئے اتنا کافی ہے، ہاں جہاں ہم نے سندھ، گجرات کے علم برداران حدیث کا ذکر کیا ہے۔ وہاں شمالی ہند کے ان نیک نفسوں کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے، جنہوں نے کسی نہ کسی درجہ میں اس صورت حال کے بدلنے کی کوشش کی اس سلسلہ میں بعض بدعات کا ذکر بھی آئے گا۔

کیا ذکر، کہ شمالی ہند کی سرزمین ”حدشا“ اور ”اخرنا“ کی آوازوں سے مسر نا آشنا تھی، یہاں ماوراء النہر سے اسلام آیا اور وہیں سے علم بھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا علم فقہ اور اصول فقہ سے آگے نہ بڑھ سکا، اسی کی جامد تقلید پر یہ قانع ہو گئے اور متاخرین فقہاء کی کتابیں ”اصل دین“ قرار دے دی گئیں اور یونان کی سڑی ہوئی ہڈیوں پر فاتحہ خوانی دینی خدمت کے ہم معنی سمجھ لی گئی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ہندوستان میں حدیث کا چرچا کبھی ہوا ہی نہیں۔ ہاں البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ سندھ اور گجرات کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر شمالی ہند میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ) بلکہ امام ولی اللہ دہلوی (۱۱۷۶ھ) سے پہلے سنت کی گرم بازاری نہیں ہوئی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ حسن بن محمد صفغان (۶۵۰ھ) سے پہلے، درہ خیبر سے آنے والے مسلمانوں میں، حدیث کا کوئی مستند عالم پیدا نہیں ہوا، نویں صدی ہجری میں بھی، جبکہ گجرات میں حدشا و اخرنا، کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا، دلی اور اس کے نواح میں گھٹا ٹوٹ اندھیرا چھایا ہوا تھا، تا آنکہ شیخ علی متقی (۹۷۵ھ) کا دور آیا، اور انھوں نے معقولات اور فروع کی اندھیاری میں حدیث کی شمع روشن کی، لیکن صفغانی اور علی متقی دونوں سے پانچ چھ سو برس کی اندھیاری کا نور نہیں ہو سکتی اور درہ خیبر سے آنے والے عالموں اور صوفیوں اور پادشاہوں کی پیشانیوں کے بدنما داغ، ان دو کارناموں سے نہیں مٹ سکتے اور گجرات میں بھی یہ حدیث و سنت کی چہل پہل اسی وقت تک رہی جب تک شمالی ہند کا سایہ اس پر نہیں پڑا، بیچ کی دو صدیوں (۷۹۹-۹۸۰ھ) میں وہ مرکزی حکومت کے دباؤ سے محفوظ رہا تو علم و عمل کی خوب گرم بازاری رہی اور جب اکبر (۹۶۳-۱۰۳۳ھ) نے مملکت گجرات کو بھی اپنے قلمرو میں شامل کر لیا تو یہاں بھی وہی جہل اور تاریکی لوٹ آئی۔

حدیث سے بے اعتنائی کی ایک مثال ملاحظہ ہو، تاریخوں میں شیخ نظام الدین اولیا (۷۲۵ھ) اور بعض علماء کے مناظرہ کا حال آتا ہے، بحث ”سماع“ سے متعلق تھی، اثناء گفتگو میں شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ”حدیث“ (؟) پیش کی تو مقابل والے بول اٹھے۔

محمد تعلق (۷۵۲-۷۲۵)

اس سلسلہ میں بادشاہوں کے زمرہ میں سب سے پہلے محمد تعلق کا نام زبان پر آتا ہے، محمد تعلق سے پہلے قطب الدین ایک (۶۰۲-۶۰۶ھ) اور شمس الدین اتمش (۶۰۷-۶۳۳ھ) جیسے معتدل اور صاحب حزم فرماں روا بھی گزرے ہیں لیکن دینی تجدید کے سلسلہ میں، ان کا کوئی قابل ذکر کارنامہ ہمارے سامنے نہیں۔ ہمارے علم میں محمد تعلق پہلا بادشاہ ہے جس نے بدعات کی تیخ کٹی اور شعائر اسلام کے رائج کرنے کی دلی کوشش کی، اس کے ”جنون“ اور سخت گیری کے بارے میں کو کچھ کہا جائے، پر ہمیں یہ محبوب ہے، اس لئے کہ اس نے حکومت کی گدی پر بیٹھ کر مذہب کو فراموش نہیں کیا۔

ابن بطوطہ (۷۹۴ھ) کے سفرنامہ میں اس کے دربار اور اخلاق و عادات کی دلچسپ تفصیلات ملتی ہیں محمد تعلق کے متعلق اس چشم دید شہادت سے زیادہ مستند بیان نہیں مل سکتا، ابن بطوطہ لکھتا ہے۔

”دین کے شعائر اس کے ہاں محفوظ ہیں اور نماز کے معاملہ میں وہ سخت گیر ہے تارکین کے لئے سزائیں مقرر ہیں۔“
جلد ۳ ص ۲۱۲ مطبوعہ پیرس

”سلطان نمازوں کی حرمت برقرار رکھنے میں بہت سخت تھا، جماعت کی سخت تاکید تھی، ترک صلوٰۃ پر سزائیں دیتا تھا، صرف اس جرم میں اس نے ایک دن نو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جن میں ایک گویا تھا، بازار میں ان کے کارندے جاتے، جماعت کے وقت جو کوئی بھی ملتا سزا کا مستوجب ہوتا“ ص ۷-۲۸۶ جلد ۳

”پہلے غیر شرعی محصول لئے جاتے، ۷۴۱ھ میں محمد تعلق نے تمام ناجائز ٹیکس منسوخ کر دیئے۔ صرف زکوٰۃ اور عشر کی وصولی باقی ہے“ ص ۲۸۸۔

”آستانہ خلافت سے تعلقات کی تجدید بھی اسی کا کارنامہ ہے عبد فیروز شاہی کے ایک مستند مورخ کے بیان کے مطابق شمس الدین اتمش (۶۰۷-۶۳۳) بھی بارگاہ

خلافت کے ”اذن و منشور“ سے مشرف ہوا تھا بعد کے بادشاہوں نے اس سے غفلت برتی اور سلاطین ہند کا رشتہ مصر کی عباسی خلافت سے ٹوٹ گیا، تا آنکہ محمد تعلق سریر آرائے خلافت ہوا اور اس نے یہ رسم کرنی شروع کی، بادشاہ کو خیال تھا کہ بارگاہ خلافت کی ”اذن و منشور“ کے بغیر اس کے احکام شرعی طور پر قابل قبول نہیں ہوں گے، اسی اعتقاد کی بنا پر اس نے ۷۴۴ھ میں حاجی رجب برقی کو عریضہ اور ہدایات کے ساتھ مصر بھیجا۔ اور ۷۴۵ھ میں محمد تعلق نے بارگاہ خلافت کی شمشیر کمال عقیدت کے ساتھ زیب کمر کی، اس کے بعد پھر ہر سال ”مناشیر“ خلافت آنے لگے اور محمد تعلق کے انتقال کے بعد اس کے جانشین فیروز شاہ کو بھی ”منشور و خلعت“ سے نوازا گیا اور اب تک ہر سال یہ نوازش ہوتی ہے۔ تلخیص از سیرت فیروز شاہی مخطوطہ خدابخش لاہور ص ۲۸۰-۲۸۵

سیرت فیروز شاہی کے مندرجہ بالا بیان کی تائید ابن بطوطہ کی اس تفصیل سے بھی ہوتی ہے۔ (۸)

”سلطان نے خلیفہ ابوالعباس کو مصر ہدایا بھیجے، اور ”خلیفہ“ سے ہندوستان اور سندھ پر حکومت کی اجازت طلب کی، خلیفہ نے اس کی درخواست قبول کی اور مصر کو شیخ الشیوخ، رکن الدین کی معرفت مطلوبہ اجازت نامہ بھیج دیا، شیخ رکن الدین کی آمد پر سلطان نے اس کی توقیر و تعظیم میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا“۔ (ص ۲۳۸ ج ۲)

ان بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ محمد تعلق کو مقام خلافت سے گہری عقیدت تھی، امیر غیاث الدین محمد بن عبدالقادر بن یوسف بن عبدالعزیز بن مستنصر باللہ عباسی کی آمد اور ان کی توقیر کی تفصیلی سرگزشت ابن بطوطہ نے درج کی ہے (جلد ۳ ص ۲۵۸-۲۶۶) اس سے بھی اس کی دلی کیفیت اور عباسیوں سے محبت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ مصر کی نام نہاد خلافت جیسی بھی رہی ہو، پر محمد تعلق کی یہ عقیدت مقام خلافت کے ساتھ تھی

فیروز شاہ نے ہندوانہ تصوف پر بھی نگاہ رکھی، گجرات کے ایک صوفی کا حال بیان کرتا ہے۔

”گجرات میں ایک شخص نے اپنے کو ”شیخ“ مشہور کرنا شروع کیا، اپنے مریدوں کے غول میں اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ ”انالحق“ کہتا اور سب یک زبان ہو کر اس کی تائید کرتے، وہ اپنے کو ”باقی“ اور ”غیر فانی“ بھی کہتا۔“ (ملاحظہ ہواصلاح ۷)

بادشاہ کے حکم سے اس گجراتی زندیق کی ایک کتاب جلادی گئی، لیکن یہاں تو سارا ملک اس قسم کی آوازوں سے گونج رہا تھا، بیچارہ فیروز شاہ کہاں تک کیا کرتا؟ اس کی زبانی ہمیں یہ بھی پتہ چلتا کہ اسی وقت سے مسلمان عورتیں قبروں کی زیارت کو جانے لگی تھیں، سنئے ”شہنشاہ“ کہتا ہے۔

”مسلمان شہروں میں ایک غیر شرعی رواج عام ہو گیا ہے متبرک دنوں میں عورتیں پیادہ پا، یا سواریوں پر جھنڈ کی طرح جھنڈ مقبروں کی زیارت کو جاتی ہیں۔“ (ملاحظہ ہو اصلاح ۱۸)

بادشاہ نے اس بری عادت کے روکنے کی بھی کوشش کی۔ تفصیل کہاں تک کی جائے مختصر طور پر خود فیروز شاہ کی ترتیب کے مطابق، ذیل میں فتوحات کا خلاصہ (۱۱) درج کرتے ہیں۔

- (۱) پہلی بادشاہتوں میں مسلمانوں پر ناروا ظلم ہوتے تھے، میں نے ان سب کا خاتمہ کر دیا (ص ۳۷۵، ٹیٹل)
- (۲) خطبہ میں ان بادشاہوں کی یاد تازہ کرائی جن کی بدولت آج اس ملک میں اسلامی چرچہ سننے میں آتا ہے (ص ۲۷۶، ٹیٹل)
- (۳) اگلے بادشاہوں کے زمانہ میں ناجائز ٹیکس وصول کئے جاتے تھے میں نے تمام ناروا اور غیر شرعی ٹیکس منسوخ کر دیئے اور جو تحصیل کنندہ غیر شرعی ٹیکس وصول کرتا، اسے سزا دی جاتی۔ خزانہ عامرہ میں اب صرف وہی محصول داخل

جو اپنی جگہ پر مسلمانوں کی بین الاقوامی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے قابل قدر اور دوسرے بادشاہوں سے اسے ممتاز کرتی ہے۔

ابن بطوطہ کے سفر نامہ (جلد ۳ ص ۲۵۲) سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) کے شاگردوں سے اس کے تعلقات تھے۔ ابن بطوطہ، شیخ عبدالعزیز الارودیلی کی آمد اور سلطان کی طرف سے توقیر و تکریم کا ذکر کرتا ہے۔ (ص ۲۵۲)

یہ شیخ عبدالعزیز دمشق میں امام ابن تیمیہ، جمال الدین المرزی (م ۷۴۲ھ) اور حافظ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) کے سامنے زانوئے تلمذتہہ کر چکے تھے اس لئے سلطان پر ان کا اثر ضرور ہوا ہوگا۔ بھلا یہ کوئی بات ہے کہ ابن تیمیہ کا فیض یافتہ دربار میں آئے اور اپنا اثر نہ چھوڑ جائے (۹)۔ دینی تجدید کے علاوہ محمد تعلق اپنی علمی قابلیت کے لحاظ سے بھی ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ (فہرست مشروح انگریزی خدائش لائبریری، جلد ۷ ص ۲۷)

فیروز تعلق ۷۵۲-۷۹۰

محمد تعلق کے جانشین فیروز تعلق نے بھی اپنے پیش رو کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور بہتری ہندوانہ رسوم کی اصلاح کی، خوش قسمتی سے اس کی اصلاحی کوششوں کی مختصر روئیداد، خود اسی کی زبانی ہم تک پہنچ گئی ہے۔ فتوحات فیروز شاہی (۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوویت کس حد تک مسلمان دماغوں پر چھا گئی تھی، فیروز شاہ لکھتا ہے۔

”زندیقوں کا ایک گروہ مستقل طور پر لوگوں کو زندقہ اور الحاد کی ترغیب دیا کرتا تھا، رات کو وہ دوستوں اور ملنے والوں کے ساتھ ایک مقرر جگہ پر جمع ہوتے، شراب کا دور چلتا اور وہ اسے مذہبی عبادت قرار دیتے، وہ اپنی بیبیوں ماؤں اور لڑکیوں بھی ساتھ لاتے، جو جس کا دامن پکڑ لیتا، اس کے ساتھ اسے صحبت کا حق حاصل تھا میں نے اس فرقہ کے سرغناؤں کو موت کی سزا دی اور باقی کو جلا وطنی اور قید سے نوازا، کہ آئندہ اس جماعت کی دوڑ دھوپ بالکل ختم ہو جائے۔“ (ملاحظہ ہواصلاح ۶)

سن کر مذہب کا ہر بھی خواہ فیصلہ کرے گا کہ ان لوگوں کو بجا طور پر سزا دی گئی اور میں اس پاداش میں آخرت میں جزا کی توقع رکھتا ہوں“ (ص ۳۷۹)

(۹) گجرات کے وحدۃ الوجودی پیر، اس کی سزا اور کتاب کے جلانے کا تذکرہ جوش و خروش کے ساتھ کرتا ہے (ص ۳۸۰) مختصر تفصیل اور پرگری۔

(۱۰) عورتوں کو قبروں کی عام زیارت سے روکنا بھی اس کا ایک کارنامہ ہے خود اس کی زبانی سنئے۔

میں نے حکم دیا کہ کوئی عورت مزارات پر نہیں جاسکتی، اب اللہ کا شکر ہے کہ کوئی شریف مسلمان عورت قبروں کی زیارت کو نہیں جاتی یہ رواج اب بالکل موقوف ہو گیا ہے۔ (ص ۳۸۰)

آٹھویں صدی ہجری میں تو یہ مذموم رواج رک گیا تھا، لیکن آ کتاب و سنت کی عام اشاعت اور علماء کی تبلیغی جدوجہد کے باوجود طرز عام ہے، البتہ شریف عورتیں شاید کھلے بندوں جلوس بنا کر زیارت کو نہ جائیں۔ اور فیروز شاہ نے عام ”عورتوں“ کی زیارت اور میلوں کی شرک کی تردید بھی نہیں کی ہے۔

(۱۲-۱۳) ہندو جو اہل جزیہ ہیں، نئے عبادت خانوں کی تعمیر سے روک دیئے گئے جہاں کہیں کسی نئے مندر کا سراخ ملا ہے، اسے منہدم کر دیا گیا“ (ص ۳۸۰-۳۸۱)

(۱۴-۱۵-۱۶) اگلے بادشاہ سونے چاندی کے برتن، زریں لباس اور ریشمی کپڑے عام طور پر استعمال کرتے تھے، میں نے یہ سب چیزیں روک دیں، میں نے یہ حکم دیا کہ صرف وہ برتن استعمال ہوں جن کی شرع نے اجازت دی ہے۔“

نیز ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی (شمس سراج عقیف) (ص ۳۸۱-۳۸۲)

تصویروں کے امتناع کے سلسلے میں شمس سراج عقیف لکھتا ہے:-

ہوں گے، جن کی شرع نے اجازت دی ہے (۱۲) ص ۳۷۹۔ (نیز ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی (۱۳) شمس سراج عقیف)

(۴) مجھ سے پہلے یہ رواج تھا کہ مال غنیمت کا صرف ایک خمس سپاہیوں میں تقسیم ہوتا اور باقی سب کا سب خزانہ میں داخل کر لیا جاتا، میں نے اس غیر شرعی تقسیم کا سب باب کیا اور حکم دیا کہ اسٹیٹ صرف ایک خمس لے، باقی چار خمس سپاہیوں میں تقسیم کیا جائے۔“ (ص ۳۷۷)

(۵) شیعوں کے فرقہ نے جسے روافض بھی کہا جاتا ہے، اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی انھوں نے کتابیں اور رسالے لکھے، اور ہمارے مذہب کے پہلے سرداروں Pirst Chiefs of ou Religion کی بے حرمتی کی میں نے ان سب کو گرفتار کیا اور سزا دی ان کی کتابیں جلادیں، اور اس طرح پر اللہ کی فضل سے اس فرقہ کا بالکل قلع قمع ہو گیا (۱۴) (ص ۳۷۷-۸)

(۶) زندیقوں کے اسی فرقہ کا ذکر ہے جو رات کو جمع ہوتا اور عورت و مرد آزادی کے ساتھ ایک دوسرے سے ہمکنار ہوتے (ص ۳۷۸) مختصر تفصیل اور پرگری۔

(۷) ایک شخص احمد بہاری کا ذکر کرتا ہے جس نے الوہیت کا دعویٰ کیا تھا اور معتقدوں کا ایک گروہ اس کے گرد جمع ہو گیا تھا، فیروز شاہ نے انھیں سخت سزائیں دیں۔ (ص ۳۷۸ ملخص)

(۸) ایک اور رکن الدین کا ذکر کرتا ہے، جس نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا بادشاہ نے اس کی بھی خبر لی اور قتل کا حکم صادر ہوا، وہ کہتا ہے۔

”اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھ حقیر بندہ سے یہ کام لیا اور اس کے ذریعہ اس شرارت اور الحاد کا خاتمہ ہوا اور صحیح مذہب کی تجدید کی طرف میری رہنمائی کی۔ ان واقعات کو

”لیکن وہ ہندوستان کے چند متعصب ترین بادشاہوں میں سے تھا، اس نے مندر گرائے اور لوگوں کو تیرتھ سے باز رکھنے کی کوشش کی، اپنے قلمرو کے اندر بعض دریاؤں پر اشان کرنے سے بھی منع کیا، کبھی کبھی وہ اپنے جوش میں بے انصافی اور بے رحمی کی حد تک پہنچ جاتا تھا ایک برہمن کو اس حقیقت کی تبلیغ پر:-

”کہ تمام مذاہب، اگر صحیح طور پر برتے جائیں پریشور کے نزدیک قابل قبول ہیں“ تنبیہ کی اور علما سے منظرہ پر مجبور کیا، جب وہ اس پر بھی باز نہ آیا تو اسے تہ تیغ کر دیا۔

”خود ایک مسلمان نے جب اس تیرتھ روکنے پر بحث و جھگڑا کی، تو سکندر تلوار کھینچ کر چلا اٹھا ”خبیث! تو بت پرستی کی حمایت کرتا ہے“۔

اس مسلمان نے جواب دیا۔

”نہیں؟“ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ بادشاہ رعایا پر تشدد نہ کرے۔

ایک دفعہ وہ کسی مہم پر جا رہا تھا، راستہ میں ایک قلندر نے اسی کو مخاطب کر کے (شاید اس کی دہائی دے کر) دعا مانگی، بادشاہ نے جواب دیا۔

اس سے دعا مانگو، جو واقعی اپنی رعایا (مخلوق) کی بھلائی کی فکر رکھتا ہے۔

(تاریخ ہند انفلکشن، طبع ہفتم ص ۴۱۹)

انفلکشن کے علاوہ ایک معاصر ہندو مؤرخ کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی سکندر لودھی کے متعلق کچھ حسن ظن پیدا ہوتا ہے۔

فیروز شاہ کی اصلاح کی کوششیں ناکام رہیں، اس لئے کہ سکندر لودھی کو ازسرنو اس کے بعض منع کردہ رسم و رواج کا قلع قمع کرنا پڑا (۱۵)۔

غیروں (۱۶) کی ان شہادتوں کے علاوہ لودھیوں کی مستند تاریخ ”داؤدی“ میں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں، نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو۔

”ان بدعات میں سے ایک بادشاہوں کے خاص کمروں میں تصویروں کا رواج تھا، پہلے بادشاہ اسے اچھا سمجھتے تھے، لیکن فیروز نے اللہ کے خوف سے جانداروں کی تصویریں بند کرادیں اور ان کے بدلے باغات اور مناظر کی تصویر کشی کی اجازت دی“۔ (الیٹ، جلد ۳ ص ۳۶۳)

ان اصلاحات کے علاوہ، مسجدوں اور دوسری عام نفع کی عمارتوں کی تعمیر اور متفرق بھلائی کے کاموں کا تذکرہ ہے جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں، خاتمہ کی چند سطریں قابل غور ہیں۔

”اس کتاب کے لکھنے سے میرا مقصد اللہ تعالیٰ کی ان عنایات اور احسانات کا شکر ادا کرنا ہے جو اس نے مجھ پر کی ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ اچھے کام کرنے سے متمنی ہوں اسے پڑھیں اور صحیح طریقہ سے واقف ہوں“۔ (۳۸۸ ص)

شمس سراج عقیف بعض ایسے واقعات کا ذکر کرتا ہے جن سے فیروز شاہ کی مذہبی پابندی پر مزید روشنی پڑتی ہے، اس سے پہلے برہمنوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا، عہد فیروز شاہی میں ان پر بھی جزیہ عائد کیا گیا جو ان کے مسلسل احتجاج اور فاقہ کشی کے باوجود قائم رہا (الیٹ جلد ۳ ص ۳۶۶) اسی طرح ایک برہمن کے سردر بار جلانے کا واقعہ شمس سراج عقیف کی عینی شہادت کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے قصہ یہ ہے کہ دہلی میں ایک برہمن بتوں کی پوجا برسر عام کیا کرتا تھا، جہاں ہندو تو ہندو، مسلمان بھی شریک ہوتے، آخر افسروں کو خبر ہوئی، برہمن دربار میں بلایا گیا اور پھر اسے سزا دی گئی۔ (ص ۳۶۵)

سکندر لودھی ۸۹۴-۹۲۳

سکندر لودھی کے متعلق اتنا تو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ عالم، علم دوست اور صالح بادشاہ تھا۔ انفلکشن نے تاریخ ہند میں اس کی بڑی برائی کی ہے اور جرم وہی تعصب، بربریت اور مذہب کا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ واقعی مذہبی لحاظ سے سرگرم اور قابل تعریف رہا ہوگا۔ انفلکشن کا پورا بیان ملاحظہ ہو۔

کرتے دیکھا ہے، اب آئیے اسی دوران میں امیر صاحب قرآن کا اسلامی جہاد بھی ملاحظہ فرمائیے، نویں صدی ہجری کا شروع ہے (۱۸) اور آل تعلق (۷۲۱-۸۱۵ھ) کا آفتاب غروب ہو رہا ہے۔

فیروز تعلق کی وفات کو ابھی دس سال ہوئے ہیں، دلی کے تخت پر برا بھلا مسلمان نامی بادشاہ جلوہ افروز ہوا امیر تیمور (م ۸۰۷ھ) جہاد کا نام لے کر ہندوستان پر فوج کشی کرتا ہے، جہاد کا مقصد ارشاد ہوتا ہے۔

”ہندوستان آنے اور ان تمام مشقتوں کے برداشت کرنے سے میرے خاص دو مقصد ہیں۔ سب سے پہلے اسلام کے دشمن، بت پرستوں سے جنگ کرنا دوسرا مقصد دنیوی ہے وہ یہ کہ بت پرستوں کے مال و دولت کو لوٹ کر اسلام کی سپاہ کچھ حاصل کر سکے۔“ (ملفوظات تیموری، ایٹم جلد ۳ ص ۴۶۱)

کیا کہتے ہیں، مفتیان شرع متین اس جہاد (؟) کو جہاد شرعی کہا جائے گا؟

اتفاق سے ایک جگہ (Bhatnir) ہندو مسلمان مل کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں، وہاں مسلمانوں پر ”کفر“ کا فتویٰ صادر ہوتا ہے۔

اب قلعہ میں مسلمانوں اور بت پرستوں کا حال برا تھا، بت پرستوں نے اپنی بیبیوں اور بچوں کو گھروں میں بند کر کے آگ لگا دی اور وہ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن اسلام کی راہ سے الگ ہو گئے ہیں، انھوں نے اپنے بچوں اور عورتوں کو قتل کر ڈالا، خود جان پر کھیل کر میدان میں کود پڑے۔ (ص ۴۲۶)

یہ تو ہم نے مانا کہ ہندوستان کے یہ مسلمان راہ راست سے الگ ہو گئے تھے، لیکن چنگیز اور ہلاکو کے طریقہ پر یہ قتل و غارتگری اسلام نے کہاں سکھائی ہے؟

ملفوظات میں تیمور بار بار کہتا ہے۔

”کہ یہ ہم ہندوستان کے بت پرستوں اور مشرکوں کے خلاف جاری کی گئی ہے۔ ص ۳۹۷، ۳۹۴، ۳۹۵

”وہ ایک پر جوش مسلمان تھا، اس نے بت پرستوں کے مختلف عبادت خانے منہدم کر دیئے، اس نے بت پرستی کے مرکز، متھرہ کی تیرتھ گاہیں تباہ کر دیں اور مشہور ہندو عبادت خانوں کو کارواں سرائے اور مدرسوں میں منتقل کر دیا، تاریخ داؤدی، ایٹم جلد ۳ ص ۴۲۷

اس نے نو مسلموں کو مختلف جگہوں میں زمینیں دیں (ص ۴۲۷) اس طرح پر ہر شہر اس کی خواہش کے مطابق اسلامی رسم و رواج کا پابند ہو گیا۔

سرسالار مسعود کے نیزہ کا سالانہ جلوس اس نے یک قلم موقوف کر دیا۔ (ص ۴۲۸)

عورتیں بھی قبروں کی زیارت سے روک دی گئیں۔ (ص ۴۲۸)

محمد تعلق فیروز تعلق، سکندر لودھی کے متعلق ان بیانات سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مذہب سے لگاؤ تھا اور وہ جس چیز کو شرعی طور پر برا خیال کرتے تھے، اس کے روکنے اور مٹانے کی بھی کوشش کرتے تھے۔

پر دشواری یہ تھی کہ مذہب کی روح سے ناواقفیت اور اسلام کے قانون حرب سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے وہ اپنے جوش میں ایسے کام بھی کر جاتے تھے جن کی شرع نے اجازت نہیں دی عرب اور درہ خیبر سے آنے والے بادشاہوں کے درمیان یہی بڑا فرق ہے، محمد بن قاسم نے اپنی ساری جنگی مہم میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جسے اسلام کا قانون حرب روا نہ رکھتا ہو، وہ اور اس کے ساتھی صحیح اسلام کا نمونہ دیکھ کر آئے تھے، درہ خیبر سے آنے والے بیچارے کتاب و سنت سے یکسر نا آشنا۔ بس متاخرین کی فقہ اور اس کی جزئیات میں الجھے ہوئے دین کی اصلی روح سے بیگانہ رہے، اس لئے اگر ان میں فیروز تعلق جیسا زندہ دل پیدا بھی ہوا ہو، اسے صحیح راہ دکھانے والا کہاں سے ملتا؟

اس بے راہ روی کا ایک اور نمونہ پیش خدمت ہے، ابھی آپ نے محمد تعلق (م ۵۲ھ) فیروز تعلق (م ۷۹ھ) اور سکندر لودھی (۱۷ھ) (م ۹۲۳ھ) کو اسلام کے نام پر اصلاح کرتے اور کافروں پر سختیاں

کرتے تھے، نامور معاصر مورخ سید ہاشمی فرید آبادی (تاریخ ہند جلد ۳ ص ۱۱۲) کی یہی رائے معلوم ہوتی ہے۔ مولانا ابوالکلام مدظلہ نے تو سید محمد جوپوری کی مدافعت کا حق ادا کر دیا ہے (ملاحظہ ہو تذکرہ ص ۲۶-۶۰) ان کے خیال میں سید محمد مہدی سے ”مہدی آخر الزماں“ نہیں مراد لیتے تھے،

سید ہاشمی اور مولانا ابوالکلام دونوں صاحبوں نے حضرت مجدد اور شاہ صاحبؒ کی رائیں نقل کی ہیں اور سکوت کو ترجیح دی ہے، ہم بھی سکوت ہی کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اس وقت جو مہدوی فرقہ ان کی طرف منسوب ہے اور نواح مدراس و حیدرآباد میں پایا جاتا ہے اس کے خیالات تو بلاشبہ حد درجہ اگر اہانہ ہیں۔

سید محمد جوپوری کی دعوت کے ثمرات ابھی اچھی طرح ظاہر بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ ان کے ماننے والوں پر سختیاں شروع ہو گئیں، یہ دسویں صدی ہجری کا آغاز تھا، اسی زمانہ میں ہمایوں (م ۹۶۳ھ) ایران سے ”شیعیت (۲۰)“ کا تحفہ لایا۔ جس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی، اب تک تو ”خشک فقاہت“ یا ہندوانہ تصوف ہی کی برائیاں تھیں، اس نئی آمیزش سے ایک نئے فتنہ کی پرورش شروع ہوئی، جو بعد کی صدیوں میں اسلامی ہند کا ایک مستقل مسئلہ بن گیا۔

دور ضلالت ۹۶۳-۱۰۱۴ھ

یہ سب جو کچھ کہا گیا، اس دور سے پہلے کی سرگزشت تھی، جس میں دین حنیف کو یکسر مخ کرنے کی کوشش کی گئی اور جس عہد کو بد قسمتی سے آج ہندو مسلم تاریخ کا زریں عہد کہا جاتا ہے، ہماری مراد اکبر (۹۶۳-۱۰۱۴ھ) کا دور ہے، اس سے پہلے کے مسلمان نام رکھنے والے بادشاہ مذہب سے ”لا پروا“ (Indifferent) ضرور تھے لیکن انھیں مذہب سے عناد نہ تھا اور نہ اصول مذہب میں ترمیم و تفسیح کا خیال ان کے دل میں آیا تھا صرف علاء الدین حسین شاہ سلطان بنگال (۸۹۹-۹۲۷ھ) کے متعلق روایت ہے کہ اس نے ستیہ پیر کی عبادت کو رواج دے کر ایک مذہبی مجنون تیار کی تھی (۲۱) (ستیہ کے معنی زراں یا دشمن کے ہیں) ممکن ہے کہ دو ایک مثالیں اور بھی مل جائیں پر یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ اکبری راج سے پہلے مذہب اور اصول مذہب میں یہ افتراقی

لیکن قتل و نہب کے وقت ہندو مسلم کا امتیاز جاتا رہا، ایک جگہ اور کچھ شور پست قطع طریق کی تشبیہ کے سلسلہ میں رقمطراز ہے۔ وہ صرف نام کے مسلمان تھے، چوری اور ڈاکہ میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ص ۲۲۸

اب ان کے ”سچے مسلمانوں“ کے فرد عمل و اعتقاد کا جائزہ لیجئے، شیخ فرید گنج شکر (۶۷۷ھ) کے مقبرہ کی زیارت کا حال لکھتا ہے۔

مجھے اطلاع دی گئی کہ حضرت شیخ فرید گنج شکر رحمۃ اللہ کا مقبرہ اسی شہر میں ہے میں فوراً زیارت کے لئے روانہ ہوا، فاتحہ پڑھی اور امداد کے لئے دوسری دعائیں پڑھیں۔ اور ان کی مقبول روح سے کامیابی کی التجا کی“ (ص ۲۲۱) (۱۹)

ممکن ہے خوش عقیدہ لوگ اس گرفت کو ”توہب“ سے تعبیر کریں، لیکن سچائی سچائی رہے گی اور قبروں کی پرستش مردوں سے التجا و خواست اور دوسری بدعات کبھی روانہ نہیں رکھی جاسکتیں؟

بہر حال کہنا یہ ہے کہ دسویں صدی ہجری سے پہلے کے مسلمان بادشاہ معذور تھے، اس وقت اسلام کی صحیح تعلیم عام نہ ہو سکی تھی، اس لئے اگر کوئی صاحب دل اور صاحب عمل پیدا بھی ہوا تو صحیح راستہ پر نہ چل سکا اور اس کی ذات سے اسلام اور مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچ سکتا تھا نہ پہنچ سکا۔

خیر بادشاہوں میں تو بعضوں نے اپنی سمجھ کے مطابق اصلاح کی کوشش بھی کی، لیکن ”علماء“ اور ”مشائخ“، یا تو تھے ہی نہیں اور تھے تو اپنے فرائض سے غافل، کچھ پاک باز صوفی ضرور تھے اور یہ انھیں کی خاموش دعوت کا اثر ہے کہ آج اس دین میں مسلمان نظر آتے ہیں، پر وہ اپنی گوشہ نشینی کے باعث بدعات کے مٹانے سے قاصر تھے، اور تو اور ان بزرگوں کی قبریں خود بدعات کی آماجگاہ تھیں۔ !

علماء و مشائخ کے زمرہ میں سید محمد جوپوری (۸۳۷-۹۱۱ھ) کا نام آتا ہے، جنھوں نے مہدویت کا دعویٰ بھی کیا تھا اصلاح زسوم اور بدعات کی تضحیح کے سلسلہ میں ان کی خدمات مشہور ہیں، ”پر مہدویت“ کے دعوے کی وجہ سے ان کے متعلق رائیں بہت مختلف ہو گئیں ہیں، بعض مستند مورخوں کا خیال ہے کہ وہ ”مہدویت“ سے صرف ”احیاء سنت“ کا ارادہ

توازن خراب کر رکھا تھا اور آئے دن اس کے عقیدے میں تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔

اکبر کی اس بے راہ روی میں اس کی غیر مسلم بیویوں کا بھی دخل تھا، انہوں نے اس کے ”ہندوانے“ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، حرم میں ہندو عورتوں کی موجودگی ہی ہندوانہ ماحول بنانے کے لئے کافی تھی قصر شاہی میں عبادت خانے بنائے گئے اور بتوں کی پوجا کا انتظام ہوا، ہندو تہواروں کے موقع پر قصر شاہی میں عام عید منائی جاتی، گاؤ کشی جرم قرار دی گئی، شام کو جب چراغ جلتے تو اکبر تعظیم کے لئے کھڑا ہوتا، درباری لباس بالکل ہندوانہ ہو گیا، داڑھی بھی چہروں سے غائب ہونے لگی مختصر یہ کہ سارا ماحول یکسر ہندوانہ ہو گیا، اور قصر شاہی کے آداب و اطوار بالکل ہندوانہ رنگ میں رنگ گئے اس دور کے لباس، تعمیر، مصوری، ہر چیز سے ”ہندویت“ ظاہر ہوتی ہے، فتح پور سیکری کی مسجد ہو، یا شیخ سلیم کا مقبرہ، ہندو اثر بالکل نمایاں ہے، شیخ سلیم چشتی کے مقبرہ کے بارے میں ونسٹ اسمتھ اظہار رائے کرتا ہوا لکھتا ہے۔

”اتنے بڑے پر جوش مسلمان فقیر کے مقبرہ میں ہندو اثرات دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، عمارت کی پوری ساخت ہندو جذبہ کو ظاہر کرتی ہے“ Akbar, The Great Mughal P.P.442,443 اسی طرح Hanell کی رائے میں فتح پور سیکری کی مسجد، مسجد سے زیادہ دشمنوں مند، معلوم ہوتی ہے (A Handbook of Indian Art P.65) لباس اور مصوری کو بھی اسی پر قیاس کیجئے، اس ”ہندوانہ“ رنگ کی بعض مثالیں آگے آتی ہیں۔

دورا کبری کی اس کج روی کا بڑا سبب ”علماء سوء“ بھی ہیں ان کی آپس کی منافست، دنیا کی محبت اور دین کی سطحی واقفیت نے آگ پر تیل کا کام کیا یہ ”عالمان دین“ کی بزدلی اور فرائض سے غفلت ہی کا نتیجہ تھا، کہ انہوں نے ایک مہمل محضر نامہ پر دستخط کئے (۹۸۷ھ) اس کا مضمون یہ تھا کہ بادشاہ ظل اللہ ہے، امام عادل ہے، مجتہد العصر ہے، کسی کا پابند نہیں، اس کا حکم سب پر بالا ہے الخ

بے شک ”خليفة وقت“ اور اہل حل و عقد کو ضرور حق اجتہاد حاصل

نہیں مچی تھی۔

اکبر کی حکومت ۹۶۳ھ سے شروع ہو کر کوئی پچاس برس کے لگ بھگ رہی۔ پہلے بیس سال میں کسی دینی فتنے کا سراغ نہیں ملتا، اس زمانہ میں عام سنی رعایا مطمئن رہی، ۹۸۳ھ سے اکبری ”اجتہاد“ (۲۲) یا الحاد کا دور شروع ہوا، جس کا سلسلہ ۱۰۰۴ھ تک جاری رہا، اس دوران میں عام سنی مسلمان سخت مذہبی فتنے سے دوچار رہے، آخری دس سال کے متعلق شہادتیں نہیں ملتیں اس لئے کہ درباری اور معاصر مورخ اپنا کام ۱۰۰۴ھ سے پہلے ختم کر چکے تھے۔ (۲۳)

اکبر اولاً تو بالکل ان پڑھ تھا، اس پر معلومات حاصل کرنے کا شوق، مولویوں اور مشائخ سے بحثیں کرتا، سنی، شیعہ، برہمن، عیسائی، یہودی، آتش پرست، ہر جماعت کے مذہبی عالم بلائے جاتے اور ”شہنشاہ“ ان کی باتیں سنتا، جس مذہب کی جو بات اچھی لگتی اسے لے لیتا، بڑھتے بڑھتے یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ تمام مذاہب حق ہیں، اور اسلام کو کوئی برتری نہیں، یہ نشہ اور تیز ہوا ایک نئے دین کی داغ بیل ڈالی گئی ”دین الہی“ نام پڑا گودر بار سلطانی سے باہر اسے کوئی مقبولیت نہ حاصل ہو سکی کہا جاتا ہے کہ اشارہ آدمی نئے مذہب میں داخل ہوئے تھے، یہ زیادہ سے زیادہ اندازہ ہے۔ (ملاحظہ ہوا انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، لفظ اکبر)

مورخین لکھتے ہیں کہ اس نے شیعہ مذہب بھی اختیار کیا تھا اور سنی علما پر بڑی سختیاں کی تھیں، فتح اللہ شیرازی اور عبداللہ یزدی کو خاص مقربان بارگاہ میں جگہ ملی، اسی طرح مبارک ناگوری کے بیٹے ابوالفضل (م ۱۰۰۱ھ) اور فیضی (م ۱۰۰۴ھ) اس کے خاص چہیتے تھے، تا آنکہ وزارت عظمیٰ کے منصب پر سرفراز ہوئے، بعض کہتے ہیں کہ وہ تصوف کی طرف مائل تھا۔

جنتی زبانیں اتنی باتیں اصل یہ ہے کہ وہ کسی عقیدہ پر جمنا نہیں تھا، اسے مذہب کے باب میں خطی کہہ سکتے ہیں۔ آفتاب اور آگ کے سامنے بھی عقیدت سے سرخم کرنا بیان کیا گیا ہے۔ حضرت مریم کو معبود بنانے اور ستاروں کی پرستش بھی اس کی طرف منسوب ہے اور تو اور اپنی عقل کو بھی وہ معصوم سمجھنے لگا تھا اور یہی بد عقلی تھی جس نے اس کا دماغی

روشن خیال اور ”سرسوتی نواز“ مصنفوں اور مترجموں کا حال ایک واقف کار ہندو اہل قلم کی زبان سنئے، ڈاکٹر تارا چند فرماتے ہیں۔

ایک اہم دلچسپی کی چیز فارسی اور ہندی لکھنے والوں کا خالق کے سامنے اظہارِ عجز و نیاز کا طریقہ ہے یہ قابل توجہ بات ہے کہ جہاں ہندو اور مسلمان دونوں کی مذہبی روایات خالق کے نام سے آغاز پر زور دیتی ہیں ان مصنفوں کے ہاں،

خالق کی حمد مذہب کی بنا پر نہیں ہوتی تھی بلکہ زبان کی بنیاد پر ہندو مسلمان دونوں، جب فارسی میں لکھتے، بسم اللہ الرحمن

الرحیم سے شروع کرتے، اور ہندی کتابوں کا آغاز دونوں گیش، سرسوتی، یا کسی دوسرے ہندو دیوتا کی تعریف سے کرتے، پہلی صورت تو عام ہے اور دوسری کی چند مثالیں

دی جاتی ہیں رحیم Madana Bataka کی ابتدا سری گیش نامہ سے کرتا ہے، جہانگیر کے دور کا ایک انشاء پرداز احمد حسین نے سمرک Samudrika پر ایک کتاب لکھی،

اسی کے نقش قدم پر چلتا ہے، احمد اللہ اپنی کتاب سری رام جی سہائے سے شروع کرتا ہے، یعقوب خاں اپنی کتاب Rasabhushana شروع کرتے ہوئے سری سرسوتی،

سری رادھا کرشن جی سری گوری شکر جی تین تین دیوتاؤں کے سامنے سرینیا زخم کرتا ہے الخ

خطبہ صدارت شعبہ دور مغلیہ، تاریخ کانگریس دسمبر ۱۹۰۷ء

تارا چند صاحب نے اور بھی مثالیں دی ہیں، ہم اتنے ہی پر بس کرتے ہیں، ممکن ہے ”تحدہ قومیت“ اور اکبری راج کے شاخونوں کے نزدیک یہ کوئی مفید اور قابل ذکر نمونہ ہو، پر ہم تو اسے مسلمانوں کے حق میں ذہنی ارتداد سے کم نہیں سمجھتے۔

اکبری دور کی یہی فتنہ سامانی تھی، جس نے مسلمانوں کی اندرونی زندگی کھوکھی کر دی، زندگی کا سارا نظام ہندوانہ سانچے میں ڈھلنے لگا، معروف اور منکر کا امتیاز جاتا رہا، اور خدا نخواستہ اگر یہ ارتداد یا ترقی معکوس

ہے، لیکن یہ حق اجتہاد اکبر۔ جہانگیر، رضا شاہ، کمال، اتاترک اور امان اللہ جیسے دین سے بے بہرہ فرمان رواؤں کو نہیں دیا جاسکتا۔ اگر ایسے بادشاہوں کو اجتہاد کا منصب عطا کر دیا جائے اور پھر ابتری اور بدامنی عام نہ ہو تو تعجب ہے۔ اکبری دور کے علماء سوء مخدوم الملک اور عبدالنبی نے محض پردستخط کر کے، اپنے کو جس عذاب الیم کا سزاوار بنایا وہ تو خیر قادر مطلق ہی جانتا ہے البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے زیادہ اس زمانہ کے ”علماء سوء“ کی نااہلی کا اور کوئی ثبوت نہیں مل سکتا، تلخ نوائی معاف! اور سچی بات تو یہ ہے کہ مختلف زمانوں اور ملکوں میں دین پر جتنے صدے آئے ہیں وہ سب انھیں علماء سوء کے ہاتھوں، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکبری فتنہ کی بڑی ذمہ داری ابوالفضل اور فیضی پر نہیں، بلکہ انھیں دنیا کے کتوں پر ہے، جنھوں نے بد نصیبی سے اس وقت علم دین کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا دور اکبری کے ابن جنبل، مجدد سر ہندی بالکل صحیح فرماتے ہیں۔

ہر فتورے کہ دریں زماں در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ از شومی علماء سوء است کہ فی الحقیقت شرار مردم و نصوص دین اند۔ اولئک حزب الشیطان، الا ان حزب الشیطان هم الخاسرون۔ (بحوالہ تذکرہ، ابوالکلام ص ۲۱)

یہ مختصر نامہ نئے مذہب کے اعلان کی تمہید تھا، آخر ۹۹۰ھ میں ”دین الہی“ کی تائیس کا عام اعلان بھی ہو گیا، گو خاص مقررین بارگاہ کے سوا کسی نے اس سفاہت کا ساتھ نہیں دیا، جیسا کہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں، اس ”الہی“ مذہب کے پیرووں کی تعداد بہت محدود رہی لیکن زندگی کے دوسرے شعبے اس فتنہ سامانی سے بری طرح اثر پذیر ہوئے۔ اسلامی تاریخ کے بدلے تاریخ الہی (جلالی سنہ) کا اجراء بھی اسی دور کی بدعت ہے۔ درباری مصنفین اور ان کے شاگردوں اور ان سے متاثر ہونے والوں کو شاید اپنی مسخ شدہ ذہنیت کا احساس بھی نہیں باقی رہا، عام طور پر مسلمان لکھنے والے اپنی کتابیں حمد و نعت سے شروع کرتے ہیں، لیکن دربار اکبری کے فیض یافتہ اور ان کے شاگرد اپنی ہندی کتابوں یا ہندی اور سنسکرت کتابوں کے ترجمے کا آغاز گیش یا سرسوتی کے ”متبرک“ ناموں سے کرتے ہیں، ان

علی، احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) اور ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) نے جو کام اپنے اپنے زمانہ میں انجام دیئے تھے وہی خدمت اس بوریہ نشین کے حصہ میں بھی آئی، جسے اس نے انجام دیا اور پورے کروفر کے ساتھ شان استغناء کے ساتھ، اسی شان محبوبیت کے ساتھ جواز ل سے خاصان خدا کے لئے مقرر ہے۔

حضرت مجددؑ کی دعوت جہانگیر (۱۰۱۴-۱۰۳۷) کے دور میں سرسبز ہوئی جب کہ وہ ”منکرات“ کے مٹانے اور بدعات، کا قلع قمع کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے، لاتعداد خلقت آپ کے ہاتھوں ہدایت پذیر ہوئی نزدیک اور دور سے لوگ کھینچ کھینچ کر آنے لگے، آپ تو آپ ان کے خلفا کا یہ عالم تھا کہ فوج میں تبلیغ کرتے اور افسر و ماتحت بلا تفریق ان کے ذریعہ ہدایت پاتے۔

اول اول تو حکومت وقت نے ان پر سختی نہ کی، لیکن جب رد شیعیت میں ان کی زبان صاف صاف کھلی تو اراکین حکومت میں کھلبلی مچ گئی اور بادشاہ کو طرح طرح سے ان کے خلاف اکسایا گیا..... آخر دربار سے طلبی ہوئی..... آپ تشریف لائے، شان استغناء کے ساتھ اندر داخل ہوئے سلام مسنون پر اکتفا کی اور زمانہ کے رواج کے مطابق زمین بوس نہ ہوئے تو اساطین مملکت بپھر گئے..... مجاہد وہاں بھی کلمہ حق سے باز نہ رہا، تقریر کی جس میں بدعات و منکرات کی کھلم کھلا مذمت تھی..... نتیجہ ظاہر تھا گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیئے گئے۔ سنت یوسفی وہاں تازہ ہو گئی، تذکیر و ہدایت شروع ہوئی اور آن کی آن میں قید خانہ کی کایا پلٹ ہو گئی، اور حیوان نما انسان، انسانوں میں تبدیل ہو گئے، بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ ”اس قیدی نے تو حیوانوں کو انسان اور انسانوں کو فرشتہ بنا ڈالا، یہ ولی صفت انسان تو قید خانہ کے قابل نہیں۔ بادشاہ متاثر ہوا اور پایہ تخت آنے کی دعوت دی، ولی عہد شہزادہ خرم نے استقبال کیا، خود بادشاہ نے خوش آمدید کہا اور معذرت کی۔ موقع غنیمت تھا، مجاہد نے اپنا فرض ادا کیا، اور مندرجہ ذیل امور کے نفاذ اور ان پر عمل کا مطالبہ کیا۔

(۱) بادشاہ کے لئے سجدہ تعظیم کی ایک قلم موقوفی

(۲) گائے ذبح کرنے کی اجازت

برابر جاری رہتی، تو آج ہم آپ اس حال میں نہ ہوتے، ایک ہندو استھان ہوتا، جہاں مسلمان نام رکھنے والے بھی خالد اور ابو عبیدہ کے بدلے ارجن، اور رام چندر جی کے کارناموں پر فخر کرتے (والعیاذ باللہ) اب تک ہندوستان کی تاریخیں خالص دنیاوی بلکہ غیر اسلامی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں، اور اکبر کو ناروا طور پر اکبر اعظم کا لقب دیا گیا ہے ضرورت ہے کہ مسلمان لکھنے والے، اسلامی ہند کی تاریخ کا اسلامی نقطہ نظر سے مطالعہ کریں، اس طرح پر انھیں معلوم ہوگا کہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ میں اکبری راج سے زیادہ برا وقت نہیں آیا، اس لئے اگر ہم اسے ”دور ضلالت“ سے تعبیر کرتے ہیں، تو کوئی زیادتی نہیں کرتے۔

حضرت مجدد (۲۴) سرہندی (۱۰۳۴م ۱۰۳۳ھ) (ہجری)

اب ہم اسلامی ہند کے دینی ارتقاء کی تاریخ کے اس نقطہ پر پہنچ گئے ہیں، جہاں سے صحیح اسلامی رہنمائی شروع ہوتی ہے، زمین پتی ہے تو باران رحمت کا نزول ہوتا ہے، آخر شب کی اندھیاری ہی کے بعد سپید صبح نمودار ہوتا ہے۔ جب مصیبت حد سے گزر جاتی ہے تو رحمت باری جوش میں آتی ہے۔

اسی طرح جب زندقہ و الحاد نے حکومت کی آغوش میں بال و پر نکالنا شروع کئے اور سچے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگا اور ملک کے طول و عرض میں ہر طرف ”ظلمات بعضہا فوق بعض“ کا منظر نظر آنے لگا اور ایک نئے احمد بن حنبل کی ضرورت محسوس ہوئی، تو قدرت نے ایک درویش کو ظلمت تجدد عطا فرمایا، جس نے بھارت درش کی پتر بھومی میں پہلی مرتبہ بھولے بھنگوں کی صحیح رہنمائی کی، کفر و شرک کی اندھیاری، کا نور کی اور بدعات کی شب تاری میں سنت و ہدایت کی شمع روشن کی محمد بن عبد اللہ (وحی خدا صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے دین کو بت پرستیوں کی آلودگیوں سے پاک کیا، ہندو و نہ تصوف کی جگہ توحید خالص کا بول بالا کیا اور شریعت کے دامن سے رفس کا داغ دھونے کی کوشش کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ افضل الجہاد کی سنت زندہ کی اور کلمہ حق کہہ کر سیکڑوں، ہزاروں، بلکہ پوری قوم کی قوم کے متاع ایمان کی رکھوالی کر لی۔ یہ کون تھا؟ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالین من عبادہ و نور ضریحہ، حق یہ ہے کہ وہ ”مجدد“ کہے جانے کے حق دار ہیں۔ حسین بن

اعمال کے اندر پیدا کر لی گئی ہیں، وہ کسی حال میں حسہ نہیں ہو سکتیں مجدد صاحب کا احسان ہے کہ انھوں نے اس کفرزار میں پہلی مرتبہ اس بدعت کاراز فاش کیا، انھوں نے صاف صاف فرمایا۔

النصيحة هي الدين ومتابعة سيد المرسلين عليه وعليهم الصلوة والسلام واتيان السنة السنية والاجتناب عن البدعة اللامرضية وان كانت البدعة تری مثل فلق الصبح لانه في الحقيقة لانور فيها ولا ضياء ولا للعليل منها شفاء ولا للداء منها دواء كيف والبدعة اماراة للسنة او ساكنة عنها والساكنة لابدون تكون زائدة على السنة فنكون ناسخة لها في الحقيقة ايضا لان الزيادة على النص نسخ له فالبدعة كيف كانت تكون رافعة للسنة نقیضة لها، فلا خير فيها ولا حسن فيها لیت شعری من این حکموا بحسن البدعة المحدثه في الدين الكامل الخ

(مکتوب ۱۹، حصہ ششم و نثر دویم)

سچ کہا حضرت مجددؒ نے معلوم نہیں، ان لوگوں نے (دین کامل کے اندر) اختراع کردہ بدعتوں کی بہتری اور اچھائی کا حکم کہاں سے لگا دیا

بدعت حسہ؟ کی پردہ دری میں مجدد صاحب کے اقوال اس درجہ صاف اور واضح ہیں کہ کسی تاویل کی گنجائش نہیں (۲۵)، لیکن کہتے ہیں جو مجدد صاحب کی بیروی اور عقیدت کا دم بھرتے ہوئے بھی اس میں لت پت نہیں؟ اللہ ہم سب کو سچائیوں کے پیچانے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

شیخ عبدالحق دہلوی ۹۵۸-۱۰۵۲ھ

مجدد صاحب کے کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کے معاصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی خدمات کا ذکر بھی ضروری ہے، ان کی ذات سے شمالی ہند میں علم و حدیث کو زندگی ملی، اور سنت نبوی کا خزانہ ہر خاص و عام کے لئے عام ہو گیا، ہمارے نزدیک حدیث کی خدمت اور کتب حدیث کی مزادلت خود بخود دین کی سچی روح سے قریب کرتی ہے، اگلے ”علماء“ اور صوفی بس متاخرین کی فقہ اور معقولیت میں الجھ کر رہے گئے اور کم از کم شمالی

(۳) بادشاہ اور اراکین دولت پر باجماعت نماز کی پابندی

(۴) عہدہ قضا اور شرعی احتساب کے محکمہ کی تجدید

(۵) تمام بدعات اور شرعی منکرات کا قلع قمع

(۶) غیر شرعی قوانین کی منسوخی

(۷) شکستہ اور منہدم مسجدوں کی دوبارہ تعمیر

شاہی حکم نافذ ہوا اور نصف صدی کی گھٹا توپ اندھیاری کے بعد ایک مرتبہ پھر اسلام کو اس ملک میں سر بلندی حاصل ہوئی اور عام مسلمان اس تبدیلی سے مسرور اور مطمئن ہو گئے۔

حضرت مجدد کی خدمات کہاں تک گنائی جائیں، دین اور دینی اصلاح کا ہر شعبہ ان کی افادات کا مرہون منت ہے، ایک طرف اگر ”رذروافض“ میں ان کے کارنامے آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں، تو دوسری طرف شریعت اور ہندوانہ تصوف کی باہمی کشمکش بھی انھیں کے ہاتھوں دور ہوئی، انھوں نے اس ”باطل“ تصوف کی اصلاح کی اتباع سنت پر زور دیا، اور لوگوں کو کتاب و سنت کے چشمہ صافی کی طرف واپس لانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

عاجز کے نزدیک ان کا ایک بڑا تجدیدی کارنامہ بدعت حسہ کی پردہ دری ہے، دوسری تیسری صدی ہجری ہی سے علماء سوء اور نام نہاد صوفی اپنی نت نئی بدعتوں کی پردہ پوشی ”بدعت حسہ“ کے خوبصورت اور جاذب فقرہ سے کیا کرتے تھے، کسی منکر پر حرف گیری کرو، جواب ملے گا ”بدعت حسہ“ ہے، کسی بدعت پر متنبہ کرو فوراً ”حسہ“ کی سپر سانسے آجائے گی، اللہ اللہ، رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم کا تو ارشاد ہو۔ من احدث فی امرنا ہذا مالیس منہ فہو رد، لیکن علماء سوء ہیں کہ دین کے اندر بدعات کا انبار لگاتے جا رہے ہیں اور پوچھو تو ایک جواب:- ”بدعت حسہ“ حقیقت یہ ہے کہ دین کے اندر جو اضافہ کیا جائے وہ بدعت ہے اور اس لئے ظلمت بھی ہے، حسہ اور سیرہ کی کوئی تفریق نہیں۔ میں ”دین کے اندر“ کہہ رہا ہوں، رسول کریم (مقدی بابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم) نے ”فی امرنا ہذا“ فرمایا ہے۔ لباس طعام، اٹھنے، بیٹھنے کے آداب اور طریقوں کا سوال نہیں، بحث ان جدتوں اور نوتر اشدیہ رسوں سے ہے، جو دین اور دینی

لعلہ: مزاورد

داراشکوہ اور عالمگیر کی آویزش صرف دو بھائیوں کی آویزش نہ تھی، صرف ملک گیری کی لڑائی نہ تھی، یہ دو مختلف اصولوں کی جنگ تھی، دو فکر (Ideology) کی کشمکش تھی، ایک اپنے پر دادا کے طور طریقے زندہ کرنا چاہتا تھا دوسرا اپنے پیغمبر اور ہادی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر فریفتہ تھا، کہتے ہیں کہ اگر داراشکوہ بادشاہ ہوتا، تو آج مغلیہ حکومت زندہ رہتی، ہو سکتا ہے کہ زندہ رہتی (سردست ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے) پر اسلام کا اس دیس سے جنازہ نکل ہو چکا ہوتا۔ سچی بات یہ ہے کہ اسلامی ہند کی کوئی تاریخ اس بور یہ نشین شہنشاہ کے کارناموں کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی، یہ پہلا بادشاہ تھا (اگر ہم تعلق خاندان کے بعض فرمان رواؤں کو الگ کر دیں) جس نے بتوں کی اس سرزمین میں دین حقیقی کو تقویت دی، بدعات اور منکریت کا قلع قمع کیا اور پہلی مرتبہ اس ملک کے مسلمانوں کو فرماں روا قوم کے فرد کی حیثیت دی۔

امام ولی اللہ دہلوی ۱۱۱۴-۱۱۷۶ ہجری

ایک طرف چھ سات سو سال کی گمراہیاں تھیں، دوسری طرف ایک فقیر اور ایک شہنشاہ کی مجاہدانہ کوششیں، یہ کوششیں اپنی جگہ پر آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں اور اگر عالمگیر کے جانشین لائق اور صاحب عزیمت ہوتے، تو یقینی یہ کوششیں برگ وبار لاتیں اور ان کے اچھے ثمرات ظاہر ہوتے، لیکن وہ جو کہ ہند میں ملت کے ناموس کا آخری نگہبان تھا اس کے جانشین ایسے کمزور اور بودے ثابت ہوئے کہ آن کی آن میں حکومت ڈانوا ڈول ہونے لگی اور فتنوں نے پھر از سر نو سراٹھایا۔ حسب دستور بدعات کی گرم بازاری شروع ہو گئی۔ ہندوانہ چلن، جو حضرت مجدد اور سلطان عالمگیر کی جدوجہد سے مٹنے لگے تھے پھر رواج پانے لگے، شیعیت، آخری کمزور بادشاہوں کی آغوش میں، پھر سر چڑھنے لگی، یہ تو عام فضا تھی، ”خواص“ یعنی اہل درس اور اصحاب مسند کا حال اور برا تھا، صاف صاف کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے، پر موقع ایسا آ پڑا ہے کہ بے کہے بھی رہا نہیں جاتا۔ نام نہاد فقرا اور صوفیہ، فقر کی بساط بچھا کر سادہ لوح مسلمانوں کے مال اور ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں، مدرسوں میں ابھی تک ارسطو کی سڑی ہوئی لاش پر عمل جراحی جاری ہے شمس بازغہ اور قاضی

ہند میں حدیث کا عام چرچا نہ ہو سکا، بدینی اور بد عقیدگی کا بڑا سبب یہی ہے۔ شیخ عبدالحق نے اس جہل کو دور کرنے کی کوشش کی، اور اس لئے ہم آج ان کے شکر گزار ہیں اور ان کی علمی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

شیخ کی تصنیفات بہت ہیں، فقہا اور صوفیہ دونوں ان کی شان میں رطب اللسان ہیں، معاصرت کی وجہ سے حضرت مجدد اور شیخ کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، جو بشریت کا تقاضا ہے اور ہر زمانہ میں ہوتا آیا ہے، شمس الدین سخاوی (۹۰۲ھ) اور جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) دونوں ایک دوسرے کو اپنی تالیفات میں اس طرح یاد کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، یہاں معمولی سوء تقاضا ہی ہوا تھا، جو بعد کور فح ہو گیا اور تعلقات استوار ہو گئے اور دونوں خاندانوں کے اتحاد کی اصلاح و تجدید کے کاموں کو بڑی تقویت پہنچی۔

عالمگیر اور نگ زیب ۱۰۶۸-۱۱۱۸ ہجری

یوں تو جہانگیر (م ۱۰۳۷ھ) ہی کے آخر دور سے حکومت مغلیہ کی پالیسی میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی، اور شاہ جہاں (۱۰۳۷-۱۰۶۸ھ) کے زمانہ میں مسلمانوں کو اپنے مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل رہی، نیز بادشاہ کے سترے ذوق کے طفیل کم از کم تعمیر اور فنون لطیفہ سے ہندوانہ اثرات زائل ہونے لگے، شاہ جہاں کے زمانے کی عمارتیں ایرانی اور ہندی فنون (آرٹ) کے امتزاج کا اچھا نمونہ ہیں اسی طرح روزمرہ کی زندگی میں بھی اعتماد پیدا ہونے لگا۔ پر ایک ایسے فرمان روا کی ضرورت باقی تھی جو اکبر کی پیدا کی ہوئی بیماریوں کا مداوا ہو سکے، اکبر اور اس کے حواری سالہا سال تک فتنہ الہیہ کی آبیاری کرتے رہے۔ ان کی ذہنی اور قلبی بیماریوں کے جراثیم معاشرت اور سماج کے رگ و پام میں سرایت کر چکے تھے اور جراثیم کے دفعیہ اور شجرہ خبیثہ کے تیغ بن سے اکھاڑنے کے لئے بھی ایک صاحب عزم اور صاحب فہم گیم پوش سلطان کی ضرورت تھی، جو الحمد للہ کہ ابوالمظفر محی الدین عالمگیر (اللہ اس کی آرام گاہ پر جنت کے پھول برسائے) کی تخت نشینی سے پوری ہو گئی تخت نشینی کیا تھی ایک مسلسل جہاد کا عزم، ایک نہ ختم ہونے والی جدوجہد کا آغاز

نژاد ولی اللہ بن عبد الرحیم دہلوی (۱۱۱۳ھ - ۱۱۷۶ھ) یہ دونوں کیا تھے؟ انھوں نے کیا کیا؟ اس کی تفصیل ضخیم جلدوں کی محتاج ہے، ہم اتنا جانتے ہیں کہ آج (۲۸) ہندوستان میں ایمان اور علم دین کی جو کچھ بری بھلی متاع ہمارے پاس موجود ہے وہ سب امام ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کا صدقہ ہے اور اس دلیس میں آج جہاں کہیں بھی علم اور معرفت کی سبیل جاری ہے سب کا منبع وہی ذات گرامی ہے، جس کی یاد تازہ کرنے کے لئے آج کی صحبت مرتب کی گئی ہے اور جس کی خدمت میں اس وقت ہم آپ اپنے علم اور حوصلوں کے مطابق اپنی عقیدت اور محبت کی نذر پیش کر رہے ہیں۔

راقم کے ذمہ امام ولی اللہ سے پہلے اسلامی ہند کی درسی تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کرنا تھا، مقدر پھر اس نے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے، اگر خاکی رہ گئی ہو، تو یہ اس کے علم کا قصور ہے اور اگر لہجہ میں کہیں تلخی ہو تو یہ شدت احساس کا نتیجہ ہے جس کے لئے معذرت کی ضرورت نہیں۔

نوار تلخ تری زن چو ذوق نغمہ کم یابی

حدی را تیز تری خواں چو محمل را گراں بینی

۱- ہندوستان پر بحری حملے حضرت فاروقؓ ہی کے عہد میں شروع ہو گئے تھے بلا ذری، باب فتوح السنہ، اس لئے یہ خیال کوئی بعید نہیں کہ گجرات کے علاقے جہاں یہ حملے صحابہ کرام کے قدموں سے شرف ہوئے ہوں۔

۲- ہندوستان میں اسلام کیونکر پھیلا؟ اس کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ عرب و ہند کے تعلقات (علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ) (۲) ہندوستان میں اسلام کیونکر پھیلا (علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ معارف ۱۹۲۳) انتشار الاسلام فی الہند و مسعود عالم ندوی الفیاء ج ۳، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳

- ۱۵- ملاحظہ ہو S.N. Sen کا مضمون (ہندویت اور مسلم زندگی Hinduism and Mohammadan Herence) مندرجہ Studies in Indan History اس کی تائید تاریخ داؤدی سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ درج کردہ مثالوں سے واضح ہوگا۔
- ۱۶- انقشمن اور سین نے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے غالباً تاریخ داؤدی ہی ان کا ماخذ رہی ہے اس لئے کہ لودیوں کی تاریخ میں یہ مشہور ہے۔
- ۱۷- سکندر لودی کا زمانہ تیور کے تقریباً سو سال بعد ہی یہاں محمد تغلق اور فیروز تغلق کے ساتھ مماثلت کی وجہ سے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔
- ۱۸- ملفوظات تیوری میں سمرقند سے روانگی کی تاریخ رجب ۹۸۰ھ (ایست جلد ۳ ص ۳۰) دریاے سندھ کے عبور کی تاریخ محرم ۸۰۰ھ ۳۰۹ درج ہے۔ دہلی پر قبضہ ۷ ربیع الثانی ۸۰۱ھ کو ہوا (ظفر نامہ ایست جلد ۳ ص ۵۰۲)
- ۱۹- یہ تمام حوالے ملفوظات تیوری (انگریزی ترجمہ) مندرجہ ایست (جلد ۳ ص ۳۸۹-۳۷۷) کے ہیں۔
- ۲۰- ہمایوں سے پہلے شیعیت ہندوستان میں آتو چکی تھی، جیسا کہ فیروز شاہ کے سلسلہ میں گزرا ہے ہمایوں سے پہلے اسے شاہی رسوم نہ حاصل ہو سکا تھا اور نہ اس سے ماننے والوں کی کثرت تھی۔
- ۲۱- Cultbral Fellowship in India by Atulananda Chakarbarti
- ۲۲- اکبری فتنہ پر محمدی مولانا سید مناظر حسن گیلانی کا بیسیٹ مضمون شائع ہو چکا ہے اس لئے ہم یہاں ”دور ضلالت“ پر مختصر تبصرہ کریں گے اور وہ بھی مضمون کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے
- ۲۳- اکبری فتنہ کا سب سے بڑا حامی ابوالفضل (صاحب اکبر نامہ و آئین اکبری) ۱۰۰۱ھ میں مقتول ہوا اور سب سے تلخ نقاد عبدالقادر بدایونی صاحب منتخب التواریخ کی وفات ۱۰۰۳ھ میں ہوئی۔
- ۲۴- اس مضمون کا حق یہ تھا کہ اس میں حضرت مجددؑ کے مشن اور ان کی خدمات پر تفصیلی گفتگو کی جاتی۔
- ۲۵- بدعت حسنہ (۲) کی خدمت میں مکتوبات کا دفتر بھرا ہوا ہے۔
- ۲۶- یہ نام محض تشبیلاً لئے گئے ہیں، شکوہ ان کتابوں یا مصنفوں سے نہیں، شکوہ ان پر قرآن کریم کی طرح عمل کرنے والوں سے ہے۔
- ۲۷- اسٹاڈرٹ نے اپنی کتاب میں اٹھارہویں صدی عیسوی کی اسلامی دنیا کا جامع اور درنقشہ کھینچا ہے۔ امیر کلیب رسلان کی رائے میں کوئی حاذق مسلمان بھی اس سے زیادہ صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتا تھا۔ سیرت سید احمد شہید (۵۱-۵۰) میں سٹاڈرٹ کا پورا اقتباس درج ہے۔ طوالت یہاں درج کرنے سے مانع ہے۔
- ۲۸- اسی طرح شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کے مجاہدانہ اور مجددانہ کارنامے بھی کچھ کم اہم نہیں، راقم شیخ الاسلام کی مفصل سیرت لکھا رہا ہے جو انشاء اللہ اپنے موضوعات پر جامع چیز ہوگی۔
- ۱- انیس کارہنے والا تھا اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ وہ افلاطونی فلسفہ سے متاثر ہوا ہو۔
- ۵- یہ حدیث نہیں بلکہ امام غزالی کا قول ہے، جو احیاء العلوم میں فتوے کے طور پر منقول ہے۔ غالباً فرشتہ نے اسے ”حدیث“ کہنے میں غلطی کی ہو اور بہت ممکن ہے کہ خود حضرت متدل کو غلط فہمی ہو۔
- ۶- تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقالہ ہندوستان میں علم حدیث ہمارے سامنے اس وقت اس کا عربی ترجمہ ہے جو علم الحدیث فی الہند کے عنوان سے ’الضیاء‘ (جلد ۲ ص ۵۷۳-۵۷۸) میں منسلک شائع ہوا تھا ممکن ہے ترجمہ در ترجمہ کے وجوہ سے ترتیب کلام میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہو۔
- ۷- خلیفہ بغداد نے ایش کی حکومت تسلیم کر لی تھی اور وہ ”اذن“ و قاصد سے نوازا گیا تھا یہ ۱۶ھ کا واقعہ ہے (خلافت اور ہندوستان ص ۱۳)
- ۸- نیز ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی (ضیاء برنی) و مخطوطہ کتب خانہ پشاور ص ۱۰۳ (ایست جلد ۳ ص ۵۰-۲۳۹)
- ۹- ایک طرف ہم ابن تیمیہ کے شاگردوں کی آمد کی وجہ سے توقع کرتے ہیں کہ محمد تغلق بدعات سے متفر رہا ہوگا اور دوسری طرف ضیاء برنی سرسالا مسعود کی قبر کی زیارت اور عقیدت مندانه نذر و نیاز کا ذکر کرتا ہے جس سے وحشت ہوتی ہے اور حسن ظن ختم ہونے لگتا ہے تاریخ فیروز شاہی برنی ایست جلد ۳ ص ۲۳۹ بہر حال آٹھویں صدی کے تاریک ہندوستان میں یہ بسائیت تھا۔
- ۱۰- عہد فیروز شاہی کی چار مستند تاریخیں ہمارے سامنے ہیں۔ (۱) تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی (۲) تاریخ فیروز شاہی (شمس سران، عقیف) ایست جلد ۳ ص ۲۶۹-۲۷۳ (۳) سیرت فیروز شاہی از نوادر مخطوطات خدائش لاہوریری (۴) فتوحات فیروز شاہی۔ ان میں سے پہلی دو مشہور ہیں تیسری نادر ہے اس وقت بحث اس چوتھی کتاب سے ہے۔ جو ۳۳ صفحات سے زیادہ نہیں۔ اصل کا تو پتہ نہیں چلتا لیکن اس کا مکمل ترجمہ ایست جلد ۳ ص ۳۷۷-۳۸۸ میں دیدیا گیا ہے۔ یہ خود فیروز شاہ کے قلم سے ہے۔ (ملاحظہ ہو فرسہ جلد ۱ ص ۳۷۱، نیز فہرست مشروح خدائش لاہوریری جلد ۷ ص ۲۹) فتوحات فیروز شاہی میں جن اصلاحات اور تجدیدی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے جو سیرت فیروز شاہی سے بھی ان کی پوری پوری تائید ہوتی ہے تاریخ فیروز شاہی (شمس سران، عقیف) میں بھی اس کے مذہبی کارناموں اور تشدد کا ذکر ہی ضیاء برنی کی کتاب میں عہد فیروز شاہ کی صرف ابتدائی چھ سوالوں کا ذکر ہے۔
- ۱۱- تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ایست ۲ جلد ۳ ص ۳۷۷-۳۸۸
- ۱۲- محمد تغلق کے کارناموں کے سلسلہ میں بھی اس کا ذکر آتا ہے ہو سکتا ہے کہ دونوں نے اس غیر شرعی طریقہ کے ختم کرنے کی کوشش کی ہو لیکن صدیوں کا بیٹھا ہوارنگ آسانی سے تو دور ہوتا نہیں۔
- ۱۳- ایست جلد ۳ ص ۳۶۳ بعض ناجائز محصلوں کی تفصیل بھی اس میں درج ہے۔
- ۱۴- فیروز شاہ کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ آٹھویں صدیق ہجری ہی میں شیعیت یہاں پھیل چکی تھی بہر حال یہ فیروز شاہ کی کوششوں کا اثر ہو یا ناساعد حالات کا کہ ہمایوں سے پہلے انیس سر بلندی نہ حاصل ہو سکی تھی۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال کا سبب

شاہ صاحب کی نظر میں

مولانا علامہ سید سلیمان ندوی

سچے اہل علم کی شان کتنی بلند، اور اصحاب تسلیم و رضا کا منصب کتنا اونچا ہے۔
الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (قرآن) ہاں! اللہ کی یاد سے
دل اطمینان پاتے ہیں۔

صحیح علم کی صحیح خدمت بھی ذکر اللہ کی دوسری شکل ہے، اس لئے اگر وہ
بھی قلب میں اطمینان اور روح میں سکون پیدا کرے تو عجب نہیں شاہ
صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جائے آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا
کہ یہ بارہویں صدی ہجری کے پر آشوب زمانہ کی پیداوار ہے، جب ہر چیز
بے اطمینانی اور بد امنی کی نذر تھی صرف یہ معلوم ہوگا کہ علم و فضل کا ایک دریا
ہے جو کسی شور و غل کے بغیر سکون و آرام کے ساتھ بہ رہا ہے جو زمان و مکان
کے خس و خاشاک کی گندگی سے پاک و صاف ہے۔

لیکن پھر بھی وہ اسی زمانہ میں تھے جب ہندوستان کی اسلامی سلطنت
کا شہزادہ بکھر رہا تھا، ہر طرف بے ترتیبی اور بد نظمی پھیلی ہوئی تھی، ہر طرف
بے قیدی اور بے حکمی آشکارا تھی، امراء رنگ رلیوں میں تھے، صوفیہ خانقاہ کی
جاگیروں، سرگیوں اور تالیوں میں تھے۔ اور علماء جاہ طلبیوں اور سلاطین کی
دورباریوں میں تھے۔ بادشاہ دین و دنیا کے ہر خیال سے آزاد ہو کر بزرگوں کی
دولت، رقص و سرود کے تماشوں اور حسن و جمال کے بازاروں میں لٹا رہے
تھے، رعایا بد حال اور سنگروں کے مظالم سے پامال ہو رہی تھی اس سے خزانے
خالی ہو رہے تھے اور فتنہ گرم بازاری دکھا رہے تھے یہ وہ منظر تھا جس پر ہزار
ضبط و سکون کے بعد بھی شاہ صاحب کی آنکھوں سے بالآخر آنسو کے چند
قطرے گر رہے گئے، حجۃ اللہ البالغہ کے ایک باب کے آخر میں لکھتے ہیں۔

وغالب سبب خراب البلدان فی هذا الزمان شیآن،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہر پہلو پر جس تفصیل
سے لکھنے کو جی چاہتا ہے اس کی فرصت نہیں، اور اس فرصت میں جو لکھا جاسکتا
ہے وہ پسند نہیں۔

ایسے کم مصنف گزرے ہیں جن کی تصانیف میں ان کے زمانہ کی روح
نہ ہو، یا اس میں زمان و مکان کی جھلک نہ ہو، اور کم از کم یہ کہ اپنے زمانہ کی علمی
ناقد رشناسی اور اضطراب احوال کا ذکر نہ ہو، مگر شاہ صاحب کی تصانیف کا یہ
حال ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے بالکل پاک اور گلہ و شکایت اور حرف
حکایت سے سراپا بے نیاز ہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں اس زمانہ میں
لکھی گئی ہیں جب امن و اطمینان اس ملک سے حرف غلط کی طرح مٹ گیا
تھا، سارا ملک طوائف الملوکی، خانہ جنگی، سیاسی بد امنی اور ہر طرح کے شور
و شر میں مبتلا تھا، دلی کی سیاسی مرکزیت مٹ چکی تھی، شمشیر زن اپنی بادشاہی کا
خواب دیکھ رہا تھا، سکھ ایک طرف، مرہٹے دوسری طرف، جاٹ تیسری طرف
اور روہیلے چوتھی طرف ملک میں ہر طرف اودھم مچا رہے تھے۔ اور نادر شاہ اور
احمد شاہ جیسے پر جوش سپہ سالار خیبر کے دروازے کے پاس کھڑے جب
چاہتے تھے آندھی کی طرح آجاتے اور سیلاب کی طرح نکل جاتے تھے اور
اس درمیان میں دلی خدا جانے کتنی دفع لٹی اور کتنی دفعہ بنی مگر اللہ رے دلی کے
تاجدار علم کا امن و اطمینان کہ یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا مگر نہ دلی
کو اضطراب، نہ خیال میں انتشار نہ قلم میں اضطراب نہ زبان پر زمانہ کا گلہ، نہ قلم
سے بے اطمینانی کا اظہار یا معلوم ہوتا ہے کہ بلندی کے جس آسمان یا صبر
ورضا کے جس لامکان میں تھے وہاں تک زمین کی آندھیاں نہیں پہنچتیں اور
زمان و مکان کی گردشیں وہاں اپنا کام نہیں کرتیں اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ

دعوے پر کہ ان کے بزرگوں نے بھی اس سلطنت کا کوئی کارنامہ کبھی انجام دیا تھا بے درد اور بغیر کسی محنت کے سلطنت کی دولت اور زمین پر قابض تھے اور اب گو وہ اس قابل بھی نہیں رہے تھے کہ سلطنت کا کوئی کام انجام دے سکیں، پھر بھی اس ظاہری طمطراق، تزک و احتشام، عیش و آرام اور نمائش کی زندگی بسر کر رہے تھے اور سلطنت کے مالیات کا نظام ان کی اس فضول عیاشی اور اسراف سے تہ و بالا ہو رہا تھا۔ زمیندار اپنے اپنے حلقے بنا کر سلطنت کی زمینوں پر قابض تھے اور اگر ان کو کچھ طاقت حاصل تھی تو ہر قسم کے سرکاری مطالبات کو ٹھکرا کر داد عیش دے رہے اور لوٹ رہے اور لٹا رہے تھے اور ان سرکش زمینداروں سے ہر سال مالیانہ کی وصولیابی کسی فوجی ہم کے بغیر ناممکن تھی چکلہ داروں اور عالموں کا یہی کام ہوتا تھا کہ ہر سال لڑ بھڑ کر زمینداروں کی گڑھیاں فتح کریں اور مالیانہ وصول کریں۔

اسی طرح اگر کسی خاندان میں ظاہری یا باطنی کمالات کی حامل کوئی ہستی ہو اور اس کے اطمینان کیلئے بادشاہ وقت کو کوئی روزیہ مقرر کرنا ہے تو اس کو نسلا بعد نسل اخراج زمینیں دی جا رہی تھیں۔ کہ وہ ”دعائے ازدیاد جاہ و جلال و عمر و اقبال“ میں مصروف رہیں ان کے اخلاف ان ظاہری و باطنی کمالات سے محروم ہونے کے باوجود سلطنت کے مالیہ پر بے وجہ بوجھ تھے، اور بے محنت کی روزی پا کر ملک و ملت کیلئے ان کا وجود تنگ و عار بن رہا تھا۔

یہی حال ان سلاطین اور امراء کی ان زر پاشیوں کا تھا جو وہ مدح گو شاعروں، قصہ خوانوں، گویوں، نقالوں اور فنون لطیفہ کو بہترین ادا کاروں پر صرف کر رہے تھے اور سلطنت کی بنیادیں جن حکموں پر قائم تھیں وہ کوڑی کوڑی کھتاج ہو کر زیر و زور ہو رہے تھے۔

اس غیر عادلانہ نظام کا نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہوں کو چونکہ بہر حال اپنے کاروبار کو چلانا تھا اس لئے سرکشوں اور زبردستوں کو جن سے وہ کچھ نہیں لے سکتے تھے چھوڑ کر غریب کسانوں پر اور ان پر جوان کی فرمائشوں کی تعمیل سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے کل سلطنت کے مصارف کا بار تھا، اور سارے محصول اکیلے ان ہی سے وصول کئے جا رہے تھے جس سے ملک کی بے چینی اور بد حالی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ان غیر متوازی اقتصادی حالات کا انجام تباہی کے سوا کیا تھا؟

اس ایک اقتباس سے اندازہ لگائیے کہ شاہ صاحب کی اقتصادی و سیاسی نگاہ کتنی دور تک پہنچتی تھی۔

☆☆☆

احدهما تضيقيهم على بيت المال ان يعتاد والتكسب بالاخذ منه على انهم من الغزاة او من العلماء الذين لهم حق فيه، او من الذين جرت عادات الملوك بصلنتهم كالزهاد والشعراء او بوجه من وجوه التكرى ويكون العمدة، عندهم هو التكسب دون القيامة بالمصلحة فيدخل قوم على قوم فينغصون عليهم و يصيرون كلاً على المدينة، والثاني ضرب الضرائب الثقيلة على الزراع والتجار والمتحرفة والتشديد عليهم حتى بغضى الى احجاف المطاوعين واستئصالهم والى تمتع اولى باس شديد وبغيبهم وانما تصلح المدينة بالجباية السيرة واقامة الحفظة بقدر الضرورة فليتق اهل الزمان لهذه النكته.

”اس زمانہ میں ملک کی خرابی و ویرانی کے زیادہ تر دو سبب ہیں، ایک بیت المال یعنی ملک کے خزانہ پر تنگی وہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ کسی محنت کے بغیر خزانہ سے روپیہ اس دعوے سے حاصل کریں کہ وہ سپاہی ہیں یا عالم ہیں جن کا حق اس خزانہ کی آمدنی میں ہو یا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو بادشاہ خود انعام و اکرام دیا کرتے ہیں، جیسے زہد پیشہ صوفی، اور شاعر اور دوسرے گروہوں میں سے جو ملک سلطنت کے کسی کام کے بغیر کسی نہ کسی ایسے طریقہ سے روزی حاصل کرتے ہیں جو محنت کے بغیر ان کو ملتی ہے، یہ لوگ ان کے اور دوسروں کے ذرائع آمدنی کو کم کر دیتے ہیں اور ملک پر بوجھ ہیں۔ دوسرا سبب کاشتکاروں، یو پاروں اور پیشہوروں پر بھاری محصول لگانا اور ان پر اس بارہ میں سختی کرنا ہے، یہاں تک کہ جو بیچارے حکومت کے مطیع اور اس کے حکم کو مانتے ہیں وہ تباہ ہو رہے ہیں اور جو سرکش اور نادمند ہیں وہ اور سرکش ہو رہے ہیں اور حکومت کے محصول نہیں ادا کرتے حالانکہ ملک اور سلطنت کی آبادی سستے محصول اور فوج اور عہدہ داروں کے بقدر ضرورت تقریر ہے، چاہئے کہ اس زمانے کے لوگ ہوشیار ہو کر سیاست کے اس راز کو سمجھیں۔“

شاہ صاحب نے ان چند سطروں میں جو کچھ فرمایا ہے وہ آج صفحوں اور دفتروں میں پھیلا کر لکھا جا سکتا ہے ان کی دور بین نگاہ سیاست و اقتصادیات کے جن باریک گوشوں تک پہنچ گئی تھی انہیں ان کے سمجھنے سے بھی قاصر تھے جاگیرداری سسٹم نے تمام ملک کو امراء پر بانٹ دیا تھا مرکزی کمزوری نے ان سب کی باگیں ڈھیلی کر دی تھیں، پشتینی امراء اس

انقلابی یا مجدد

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

میں ان دوستوں کی نیت پر کوئی حملہ نہیں کرنا ممکن ہے کہ یہ سب باتیں نیک نیتی کے ساتھ ہوں اور اس غرض سے ہوں کہ وہ اسلام کو ایک عالمگیر اور دنیا کے ترقی یافتہ نظریوں کا ساتھ دینے والا مذہب ثابت کرنا چاہتے ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کا یہ طرز عمل اسلام کے لئے حد درجہ نقصان رساں ہے اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ اسلام بجائے خود کوئی حقیقت ثابت نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسی رتبہ ہے جس کو کھینچنا ان کو وہ ہر قدم و قامت پر راست کر سکتے ہیں اور وہ ایک ایسا مہم و مجہول دستور ہے جس کی تشریح ہر زمانہ میں اس کے جدید رجحانات کے مطابق ہو سکتی ہے۔

اسی نوع کی ذہنی مرعوبیت کی ایک بدترین مثال یہ ہے کہ آج ہم اپنے بزرگوں کی تعریف کرتے ہیں تو اس کے لئے وہی عنوانات تجویز کرتے ہیں جو موجودہ دور سیاست میں کسی بڑے سے بڑے لیڈر کے لئے سرمایہ تازش و افتخار سمجھے جاتے ہیں اس قسم کے لفظوں میں غالباً سب سے بڑا شاندار اور پر عظمت لفظ ”انقلابی“ ہے گزشتہ چند مہینوں میں اسلامی سیاست پر جن حضرات نے مقالے لکھے ہیں انکا مطالعہ کیا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے ارباب قلم کس بری طرح جدید عنوان ستائش سے مرعوب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب ان میں اپنے ہر بزرگ کی ذات ”انقلابی“ اور اس کا ہر کارنامہ انقلاب نظر آتا ہے ان بزرگوں میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات غالباً سب سے نمایاں اور ممتاز ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کو ہندوستان کے دور آخر کا سب سے بڑا داعی انقلاب رہنما اور انقلابی کہا جاتا ہے حالانکہ اگر انقلابی کے صحیح معنی کو پیش نظر رکھا

آج کل تجدید نو از علماء اور ارباب قلم کا یہ فیشن ہو گیا ہے کہ وہ اسلام کو عالمگیر مذہب ثابت کرنے کے لئے ہر اس نظریہ اور اصطلاح کو اسلام پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کو ایک زبردست پروپیگنڈہ نے قبول عام کے بازار میں شہرت و وقعت دیدی ہو، آپ کو یاد ہوگا اب سے چند سال پہلے ”جمہوریت“ کا غوغا ہوا اس کی مدح و ثنا میں ارباب فکر و انشانے داد سخن گسٹری دینی شروع کی تو ہمارے ان علمائے کرام نے دلائل و براہین سے ثابت کیا کہ اسلام کا نظام حکومت بھی تو جمہوری ہی ہے، پھر اب موجودہ ڈیموکریسی ناکام ہوتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کے بالمقابل ڈیکٹیٹر شپ کی طرف لوگ زیادہ مائل معلوم ہوتے ہیں تو انھیں حضرات نے اب جمہوریت کی مذمت بیان کرنا شروع کر دی ہے، اور کچھ تکلم زیر لب کے انداز پر اور بعض کھلم کھلا کہہ رہے ہیں کہ دراصل اسلام بھی تو ڈیکٹیٹر شپ ہی کا قائل ہے۔ حالانکہ اگر واقعی طور پر غور کیا جائے تو اسلام کے نظام حکومت کو موجودہ اصطلاح کے ماتحت جمہوریت سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ڈیکٹیٹر شپ سے۔ بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان کی ایک معتدل راہ ہے جس میں خلیفہ نہ ڈیکٹیٹر کی طرح بالکل مطلق العنان ہوتا ہے اور نہ کسی صدر جمہوریہ کی طرح مجلس نمائندگان کا بالکل پابند۔

اسی طرح سوویت روس کی طرف سے سوشلزم کا پروپیگنڈہ ہوا تو ہم میں کتنے ہی تھے جو اس کی آن بان سے مرعوب ہو کر برملا اسلام کے اقتصادی نظام کو بھی سوشلزم پر منطبق کرنے لگے اور انھوں نے دعویٰ کیا کہ اسلام میں اور سوشلزم میں بنیادی طور پر (یہ بھی محض برسہیل احتیاط) کوئی فرق نہیں ہے

انقلابی کے ذاتی خصائص و شائل کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں تین چیزیں نمایاں نظر آئیں گی۔

(۱) تشدد اور جبر۔ (۲) افراط و بے اعتدالی۔ (۳) خود غرضی اور جذبہ

انتقام

انقلابی فرائض کے نام سے آج کون پڑھا لکھا نا واقف ہے جنہوں نے اس کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ فکری اور ذہنی تبدیلی پیدا کرنے میں فرانس کے چار مصنفوں کو بہت دخل ہے مائٹکیو، والٹیر، ویررو اور روسو، یہ چار وہ لوگ ہیں جن کی تصنیفات کو اساس انقلاب کہا جاتا ہے۔ ان میں غالباً سب سے زیادہ اعتدال پسند روسو ہے، لیکن اس کا حال بھی یہ ہے کہ وہ امن، علم، تہذیب اور مذہب و اخلاق ان سب چیزوں کا برملا مذاق اڑاتا ہے اور ان پر پھبتیاں کتا ہے مثلاً ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

تہذیب کیا ہے؟ تعیش پسندی! امن کیا ہے؟ ظلم و جور! علم کیا ہے

انسانی غلطیاں

چونکہ اس طرح کی انتہا پسندانہ باتیں شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی اندرونی جذبہ انتقام پر مبنی ہوتی ہیں اسی لئے خود روسو کے بعض عقیدت مندوں کو اس کی طرف سے کبھی کبھی شبہ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ درپردہ یہ سوال کرتے تھے۔

کیا روسو سوسائٹی کا اس لئے دشمن ہے کہ اس میں وہ اپنے لئے کوئی جگہ پیدا نہیں کر سکا؟ کیا وہ دولت سے اس لئے متنفر ہے کہ وہ اسے حاصل نہ کر سکا۔

پھر کتاب انقلاب کے مسلمہ ابواب و فصول میں غدر اور انقلاب میں کوئی فرق نہیں ہے چنانچہ انقلابیوں کا ایک عام مقولہ ہے کہ کامیاب بغاوت کا نام انقلاب ہے اور ناکام انقلاب کا نام بغاوت۔ افسوس ہے کہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے ورنہ یہ بات بہت آسانی سے ثابت کی جاسکتی ہے کہ آج کل کے مصطلح انقلاب میں جن لوگوں نے شاندار انقلابی کارنامے کئے ہیں ان میں اکثر و بیشتر ایسے ہی لوگ تھے جو ذاتی طور پر سوسائٹی کے مروجہ نظام کا شکار ہوئے اور اس کی وجہ سے انہوں نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، مثال کے طور پر میں کارل مارکس کی ابتدائی پر مصائب زندگی

جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کو انقلابی کہنا انکی تعریف و توصیف نہیں بلکہ ایک گونہ تنقیص ہے مندرجہ ذیل سطروں میں اسی حقیقت پر کچھ روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔

انقلابی کے خصائص

سب سے پہلے انقلابی اور مصلح کا فرق سمجھ لیجئے جو حضرات کی قوم میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک مصلح اور دوسرا انقلابی ان دونوں میں مایہ الامتیاز یہ ہے کہ مصلح کا راستہ نہایت معتدل اور افراط و تفریط سے بچا ہوا ہوتا ہے۔ وہ روحانی اور اخلاقی کیرکٹر کے لحاظ سے بہت بلند پایہ انسان ہوتا ہے اس کی تمام کوششیں خیر خواہی اور خیر اندیشی کے جذبہ پر قائم ہوتی ہیں۔ اس میں مستمندانہ جوش بالکل نہیں ہوتا اس کو ذاتی ترفع اور وجاہت پسندی سے بعد ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اور کہتا ہے سچائی اور ایمانداری سے کرتا اور کہتا ہے لیکن اس کے برخلاف ایک انقلابی لیڈر یا رہنما کا یہ حال نہیں ہوتا اس کے سامنے ایک نظام ہوتا ہے اس کے خیال میں نہایت ہی مکروہ، اور مذموم، وہ ہر ممکن طریقہ سے اس کو تبدیل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے عنف و درگزر بے معنی چیزیں ہیں، یہ نظام چونکہ اس کی نگاہ میں انتہا درجہ فوج اور لائق مذمت ہوتا ہے اور اس کے احساسات اس کی نفرت و حقارت سے پر ہوتے ہیں۔ اس لئے رد عمل کے اصول کے مطابق وہ اس کا انتہائی توڑ تلاش کرتا ہے اور اس پر جرم جاتا ہے۔ اس راہ میں اس کو اعتدال اور میانہ روی کا مطلقاً دھیان نہیں رہتا، مثلاً ایک انقلابی نظام سرمایہ داری کو دیکھتا ہے تو وہ اس کے مقابلہ میں سوشلزم سے کم کسی چیز پر راضی ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ انفرادی ملکیت کا ہی سرے سے منکر ہوتا ہے، اس کے لئے یہ دشوار ہے کہ وہ ملکیت کی تجدید، یا اس پر کچھ پابندیاں عائد کرنے پر رضامند ہو سکے۔

پھر جب وہ اپنی ایک شاہراہ مقصود متعین کر لیتا ہے تو وہ اس پر آکھ بند کر کے بڑی تیزی سے چلتا ہے اب اس کو گرد و پیش کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی اور نہ اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ ”زیر قدمش ہزار جانست“ والا معاملہ ہے، ایسا نہ ہو کہ سیکڑوں بے گناہ انسان اس کی تیز گامی کی نذر ہو جائیں، اس لحاظ سے ”انقلابی“ کے لئے ضروری نہیں کہ وہ فضائل اخلاق کا پابند ہو، اور روحانی مرتبہ کے لحاظ سے وہ کسی غیر معمولی حیثیت کا انسان ہو غرض یہ ہے کہ ایک

بلا واسطہ شاد کام و فائز المراد ہوتا ہے۔ دعاوی باطلہ کرتا ہے ورنہ وہ سنبھل جاتا ہے اور اس مقام سے گزر کر اس کی طبیعت میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے تہیمات، الخیر الکثیر اور حجتہ اللہ البالغہ کے شروع میں جو کچھ اپنی نسبت لکھا ہے ایک طرف آپ اس کو دیکھئے اور دوسری جانب آپ نے اپنی تصنیفات میں شریعت و طریقت کی تطبیق کی جو کوشش کی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے تو صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ آپ بے شبہ اس مقام رفیع پر سرفراز تھے جو مجددیت کا مرتبہ کہلاتا ہے لیکن چونکہ علوم ظاہر یہ درسمیہ میں بھی آپ کو بڑا کمال تھا اس لئے مجددیت کی شان کے ساتھ آپ کے قبائے عظمت میں فلسفیت کے ایک تکرہ زریں کا اور اضافہ ہو گیا ہے اور ان دونوں کی آمیزش نے حکماء اسلام کی صف میں آپ کو ایک نمایاں تر مقام پر لا بٹھایا ہے۔

مقام مجددیت

حضرت شاہ صاحبؒ خود اپنے اس مقام کا اظہار تہیمات میں اس طرح کرتے ہیں ”کہ مجھ کو میرے رب نے یہ سمجھایا ہے کہ ہم نے تم کو اس طریقہ کا امام بنا دیا اور حقیقت قرب تک پہنچنے کے تمام راستوں کو بند کر کے صرف ایک راستہ کھلا رکھا ہے اور وہ تمہاری محبت اور اطاعت کا راستہ ہے، جو شخص تمہارا دشمن ہے، اس کیلئے آسمان آسمان نہیں اور زمین زمین نہیں پس تمام اہل مشرق و مغرب تمہاری رعیت ہیں اور تم ان کے بادشاہ، اس سے غرض نہیں کہ یہ لوگ جانتے ہیں یا نہیں اگر جانتے ہیں تو کامیاب ہوں گے ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔“

ایک مقام پر فرماتے ہیں ”کہ مجھ کو بتایا گیا ہے کہ اس حقیقت کا اعلان کر دوں کہ آج وقت میرا ہی وقت ہے اور زمانہ میرا ہی زمانہ ہے، اس شخص پر حریف جو میرے جھنڈے کے نیچے نہیں ہے۔“

ایک دو تہیمات کا اول سے آخر تک مطالعہ کیا جائے تو اس میں اس بات سے متعلق اشارات و تصریحات بکثرت ملیں گی۔ پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے جو کچھ فرمایا۔ مدعیان باطل کے دعاوی کی

کو پیش کر سکتا ہوں، اس بنا پر اس کے افعال و اعمال کی نسبت یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی ذاتی غرض یا کسی جذبہ انتقام سے بالکل مبرا و منزہ تھے۔

میں اس موقع پر یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی انقلابی لیڈر کی واقعی عظمت و بزرگی کا منکر نہیں ہوں لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ میرے نزدیک ایک مصلح، مجدد اور مجاہد ملت کا مرتبہ انقلابی سے کہیں زیادہ بلند ہے، اور میں ایک لمحہ کے لئے یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ آپ اپنے کسی مجدد ملت یا مجاہد ملت کو انقلابی کے لفظ سے یاد کریں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے خصائص

انقلابی کی ان خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر اب حضرت شاہ صاحبؒ کے اوصاف و کمالات کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ حضرت شاہ صاحبؒ اسلام کے بہترین مفکر حکیم اور زبردست عالم ربانی اور اسلامی فلاسفر تھے۔ ان کی تصنیفات نے اس زمانہ کی بیمار ذہنیوں کی اصلاح کر کے انہیں پاک و صاف بنایا غیر اسلامی اوہام و تخیلات کی جگہ مسلمانوں میں خالص اسلامی تخیل پیدا کیا۔ حضرت شاہ صاحب شریعت اور طریقت فلسفہ اور تصوف عقلیات اور نقلیات کے ایسے مجموعہ و دلکش آویز تھے کہ ان کی ذات جس طرح ایک مسلمان کے لئے رشد و ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔ نامسلموں مگر انصاف پسندوں کے لئے بھی وہ بہترین معلم ثابت ہو سکتی ہے حضرت شاہ صاحبؒ کی پر زور تحریر کا اثر مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کے دل و دماغ کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اسلام کے بہترین راز دار حکیم مصلح ہیں اور پھر اپنے ہمہ گیر دلائل و براہین کی روشنی میں اسے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کو جبال انکار باقی نہیں رہتا۔ اسلام دین فطرت ہے پس جس کسی کو اس دین کے محرم اسرار ہونے کا شرف حاصل ہوگا۔ ضروری ہے کہ تمام نواہیں فطرت، اسرار و رموز عالم سے بھی پوری طرح باخبر ہو اس مقام بلند پر یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ارباب سلوک و معرفت کی اصطلاح میں انسان اپنے تئیں مجدد سمجھنے لگتا ہے۔ اب اگر کسی مرشد کامل یا علم شریعت میں مہارت کے ذریعہ حضرت حق جل و علاء کی توفیق اس کے شامل حال نہیں ہوتی تو وہ گمراہ ہو کر طرح طرح کے مجاز و قیاس و تخمین کے تمام حجابات یک قلم اٹھ جاتے ہیں اور دیکھنے والا جلوۂ جمال حقیقت کے

اشعار کے دواوین کے ساتھ یا ایک عالم منطق کی براہین حکما کے ساتھ اور وہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔“

علوم رسمیہ و طاہریہ میں مہارت

پھر ہر مجدد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ماحول کا بالکل صحیح اندازہ رکھتا ہو اپنے زمانہ کے عواطف و امیال سے پوری طرح باخبر ہو اور جدید طریقہ استدلال پر اس کو کامل عبور ہو اگر یہ چیز نہیں ہے تو اسے مجددیت میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ اپنا زمانہ کو ان کے مروجہ علوم کی روشنی میں حقائق اسلامی کو سمجھا نہیں سکے گا اور لوگ خود اسی کے طرز استدلال سے نامانوس ہو کر اس کے دلائل زیادہ توجہ کے ساتھ سن نہیں سکیں گے۔

زور تحریر و تقریر

ان کمالات کے ساتھ زور تحریر و تقریر کی نعمت سے بھی بہرہ اندوز ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر مخاطب پر مشکلم کے دلائل و براہین کا اثر کم ہوتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات گرامی ان تمام اوصاف و شمائل کی بھی جامع تھی آپ کے عہد میں علوم عقلیہ میں منطق اور فلسفہ کا زور تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ دینی و نقلی علوم میں مرتبہ امامت رکھنے کے ساتھ ان علوم میں بھی مہارت تام رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ لکھ کر انھوں نے شرعی مسائل کے باب میں ابوالحسن اشعری وغیرہ کے علم کلام سے الگ ایک بالکل نئے علم کلام کی بنیاد رکھ دی ہے جو بحث و استدلال کے لحاظ سے پہلے علم کلام سے کہیں زیادہ معقول اور نتائج کے افادہ کے اعتبار سے اس سے کہیں زیادہ قطعی الثبوت ہے۔ رہا زور تقریر! تو اس کے لئے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، جس شخص نے آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے اسکو معلوم ہوگا کہ آپ کے کلام میں حافظ ابن تیمیہ کی ہی صولت کلام اور بات کا پھیلاؤ اگرچہ بالکل نہیں ہے لیکن وہ جو کچھ فرماتے ہیں ایسے سچے تلمے اور موزوں و مناسب الفاظ میں فرماتے ہیں کہ پڑھنے والے پر اس کا اثر ہوتا ہے اور جتنا جتنا وہ آگے بڑھتا ہے عقیدت و ارادت کا نقش اسی قدر زیادہ جلی اور پختہ ہوتا جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کا عمل تجدید

ان کمالات و خصائص سے آراستہ ہو کر آپ نے جب تجدید کے

طرح محض زبانی تعلق اور خود ستائی نہ تھا۔ بلکہ ان کی تصنیفات، ان کے شاندار علمی اور عملی کارنامے اس دعویٰ کا ناقابل تردید ثبوت ہیں اس حقیقت ثابتہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب جن مضبوط بنیادوں پر اپنے دست تجدید سے اسلام کی تعمیر قائم کر گئے ہیں اس کی استواری کا یہ عالم ہے کہ حوادث و نوازل کے لاکھ سیلاب آئیں اس کو متزلزل نہیں کر سکتے آج اسلامی فلسفہ اور حقائق و معارف اسلام کی جو کچھ روشنی نظر آتی ہے غور کیجئے تو وہ سب اسی آفتاب علم کا پرتو ہے۔

فیضی احسن ازین عشق کہ دوراں امروز

گرم دارد ز تو ہنگامہ رسوائی را

علم اسرار

یہ ظاہر ہے کہ شان مجددیت اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی، جب تک کہ شریعت کے غوامض و حکم سے پوری طرح واقفیت نہ ہو اس کے بغیر ایمان محض ایمان بالغیب اور عمل صرف ”تعمیل حکم“ کے درجہ تک محدود رہتا ہے حضرت شاہ صاحبؒ قدس سرہ کو مجددیت کے مقام بلند پر سرفراز ہونا تھا اس لئے انھیں اسرار و رموز شریعت کا محرم بنایا گیا اور جو حقیقتیں دوسروں کو محض سان گمان سے معلوم تھیں آپ نے ان کا مشاہدہ کیا چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

میرے نزدیک تمام جدید فنون میں سب سے زیادہ دقیق، مرتبہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ بلند اور علوم شرعیہ میں سب سے زیادہ روشن اور مہربن دین کے اسرار کا علم ہے جس میں احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں سے اور خاص خاص اعمال کے بھیدوں اور ان کے نکات سے بحث ہوتی ہے پس خدا کی قسم یہی علم سب سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ انسان اپنی استطاعت کے مطابق اس میں اپنی نفیس ترین اوقات صرف کرے اور فرض طاعتوں کے بعد اس کو اپنے لئے ذخیرہ آخرت بنائے کیونکہ اسی علم کے ذریعہ انسان کو شرعی احکام و مسائل کی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ راخبار شرع کے ساتھ اس کی نسبت ایسی ہی ہو جاتی ہے جیسی عروض جاننے والے کی

آپ کے علوم و فنون کی حفاظت اور دیانتداری کے ساتھ ان کی نشر و اشاعت میں حضرت شاہ صاحبؒ کی جانشینی کا پورا حق ادا کیا، نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم نے اس خاندان کی نسبت کیا خوب لکھا ہے۔

”ہر یکے از ایثاں بے نظیر وقت و فرید ہر و وحید عصر در علم و عقل و ہم وقت تقریر و فصاحت تحریر و تقویٰ و دیانت و امانت، و مراتب ولایت بود، و ہم چنین اولاد اولاد ایں سلسلہ از طلائے ناب است“ (اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہا المحدثین)

لیکن خاندان ولی اللہی نے جس شاہراہ کو اختیار کیا اس کی بنیاد حضرت شاہ صاحب نے ہی ڈالی تھی، اس بنا پر مجددیت کا شرف اس تمام سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے ہی مخصوص ہے، آج ہندوستان میں علم وین کا چرچا، مذہبی، بیداری، اور شرک و بدعت سے اجتناب، اور علماء کا وقار جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب حضرت شاہ صاحبؒ کے ہی مجددانہ کارناموں کا اثر مابعد ہے، ورنہ مصر ایران اور شام و فلسطین اور ترکی و افغانستان میں مسلمانوں کی جو حالت ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اس خاندان والا نشان کی خدمات بابرکات نہ ہوتیں تو ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی حالت ان ممالک سے بھی بدتر نہ ہوتی!

پس اس علمی و عملی جلالت شان کے باعث آپ خود سوچئے کہ حجۃ الاسلام

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایک بلند پایہ مجدد تھے، یا انقلابی؟ کوئی شبہ نہیں کہ آپ زمانہ کے اعتبار سے متاخر تھے لیکن اپنے علمی و عملی اور ظاہری باطنی کمالات و خصوصیات کے لحاظ سے زمانہ سلف کے اکابر علماء و مجتہدین سے کسی طرح کم نہیں تھے بلکہ ایک بڑی حد تک ابوالعلاء المعریؒ کے اس شعر کے مصداق تھے

وَإِنِّي وَإِنْ كُنْتُ الْأَخِيرَ زَمَانَهُ

لَأَبْتَأُ بِمَا لَمْ تَسْتَطِعْهُ الْأَوَائِلُ

لیکن آپ کو ”انقلابی“ کہنا یا یہ دعویٰ کرنا کہ آپ کسی نئے فلسفہ کے علمبردار تھے، آپ کی تعریف نہیں بلکہ تنقیص ہے اور اسلام کے صحیح طریق فکر اور اس کے درست طریق اصلاح و ارشاد سے بے خبری کی دلیل ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

میدان میں قدم رکھا تو کوئی شبہ نہیں آپ نے وہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جو صحیح معنی میں ایک نائب رسول ہی کر سکتا ہے آپ نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ اخلاقی اور روحانی پستی کے لحاظ سے نہایت شرمناک دور تھا۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ غٹسنا شروع ہو گیا تھا، دربار پر شیعوں کا قبضہ تھا، تمام ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، مسلمانوں کی تعلیمی حالت یہ تھی کہ درسگاہوں میں صدراء شمس بازغہ اور شرح مطالع کے شروع و حواشی اور کثرت سے رائج تھے کہ گویا اس زمانہ میں مسلمانوں کا نصاب تعلیم ان کتابوں کے سوا کچھ اور تھا ہی نہیں دینیات میں تھوڑا بہت اگر چرچا تھا بھی تو فقہ کی چند کتابوں کا تفسیر و حدیث کا رواج بہت کم تھا بس

ایں قدر بہت کہ بانگ جر سے می آید

کا مصداق تھا، اخلاق اور اعمال کا یہ عالم تھا کہ بدعات، مشرکانہ اعمال و رسوم جو زیادہ تر ہندوؤں کے ساتھ اختلاط کا نتیجہ تھے گھر گھر رواج پذیر تھے امرا اور ارباب ثروت عیش و عشرت میں مصروف ہو کر دین حق سے غافل ہو چکے تھے حضرت شاہ صاحبؒ نے ان تمام احوال گرد و پیش کا جائزہ لے کر اپنا عمل تجدید جاری کیا تو اس طرح کہ ایک طرف آپ نے شیعیت کی تردید میں ازالۃ الخفاء تصنیف فرمائی ”مدرسہ رحیمہ دہلی“ (جو حضرت شاہ صاحبؒ کے والد ماجد کے نام پر تھا) میں قرآن و حدیث کا درس دیا جس میں دور دور کے طلباء شریک ہو کر کسب سعادت کرتے تھے اپنی پچاس سال کے قریب مدت تک اس مدرسہ میں درس جاری رکھا، اسی سلسلہ میں آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تاکہ اس کا افادہ عام ہو سکے کوئی شبہ نہیں کہ یہ اقدام بھی آپ کا غیر معمولی عمل تجدید تھا جس نے عام علماء میں ان کی خود غرضی کی بنا پر بے چینی پیدا کر دی تھی، اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے حجۃ اللہ البالغہ اور تقلید و اجتہاد پر زریں تصنیفات کر کے اس بات کی سعی بلیغ کی کہ ان میں جو ذہنی سفل اور دماغی جمود و خمود پیدا ہو گیا ہے اور جو فی الحقیقت ان کے اجتماعی سیاسی اور مذہبی انحطاط کا باعث ہے یہ دور ہو اور اس کے بجائے اجتہاد و فکر کی روشنی، آزاد غور و خوض کی عادت اور صحیح اسلامی طریقہ پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔

کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا عمل تجدید بیکاروبے اثر رہا، خوش قسمتی سے حضرت شاہ صاحبؒ کو جانشین بھی ایسے میسر آئے جنہوں نے

حضرت شاہ ولی اللہ کا ایک خاص نظریہ

علم الاخلاق اور علم المعیشت کا باہمی ربط و تعلق

مولانا حفیظ الرحمن سہاروی

تمہید

من یؤت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً (البقرہ)

جس شخص کو حکمت سے حصہ دیا گیا ہے بلاشبہ اس کو زبردست بھلائی دی گئی اور بہت بڑا کمال بخشا گیا۔

اور اگر مسطورہ بالا معرفت اور آگاہی رموز قدرت کے مطابق ہر شے کو اس کے مناسب جگہ دے تو اس کو ”حکمت عملی“ کہا جاتا ہے۔

حکمت کی عظمت

حکمت اپنے اندر کیے عظیم الشان کمالات رکھتی ہے اور حیات انسانی کے ارتقاء میں اس کا درجہ کس قدر بلند اور پر عظمت ہے؟ اس کا اندازہ جدید اور قدیم علمی کائنات کے اس ذخیرہ سے ہو سکتا ہے جو علمی نظریوں اور عملی سائنس کے ذریعہ ہماری مادی زندگی کی ترقی اور سر بلندی کی بیش بہا خدمات انجام دیتا رہا اور دے رہا ہے۔ نیز ہماری روحانی نشوونما اور کمالات کے ارتقاء کا ضامن اور کفیل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خالق علوم نے اپنی ذات کے ساتھ اس کمال کو متصف ظاہر کیا ہے۔

انک انت العلیم الحکیم

بلاشبہ تو ہی علم والا حکمت والا ہے (یعنی سرچشمہ علم و حکمت ہے)

حکمت اور علم الاسرار

یہی حکمت جب ”قوانین الہی“ (شریعت حقہ) کے راز ہائے سرست اور حقائق و رموز سے آگاہی میں استعمال کی جاتی ہے تو اس کا نام ”علم الاسرار“ ہو جاتا ہے اور اس وقت اس کا نشاء یہ ہوتا ہے کہ وہ بتائے کہ دین و مذہب کے قوانین و اصول کی طرح عقل و فطرت (نیچر) سے

حضرات کرام! اس ادبی مجلس میں جس موضوع پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے وہ اپنی حیثیت میں ایک اچھوتا موضوع ہے بلکہ بغیر کسی خود ستائی اور علمی غرور کے بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ علمی دنیا میں یہ پہلی کوشش ہے جو سپرد قلم کی گئی ہے لیکن ایسے بڑے دعوے کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو اس سلسلہ میں کہا جانا چاہئے۔ مختلف وجوہ و اسباب کے علاوہ اس اختصار کی بڑی وجہ میری عدم الفرصتی ہے اور غالباً مجلس ترقی ادب کا یہ یک روزہ اجلاس بھی طوالت کا متحمل نہ ہوتا۔

اس مقالہ کا اصل موضوع ”علم الاخلاق“ کے ساتھ علم المعیشت کا تعلق ہے، مگر حکماء اسلام میں چونکہ صرف حکیم الامت شاہ ولی اللہ (نور اللہ مرقدہ) نے اس ”تعلق“ کو ”علم الاخلاق“ میں بہت اہمیت دی ہے اور حکمت ولی الہی میں اس کا مقام بہت بلند ہے، اسلئے اگر ہم اس کی تعبیر ان الفاظ میں کریں کہ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کا خصوصی امتیاز کیا ہے تو یہ صحیح اور بر محل ہوگا۔

جدید و قدیم فلاسفہ اور حکماء نے فلسفہ و حکمت کی جو تعریفیں کی ہیں ان کا خلاصہ اور نچوڑ اس طرح کیا جاسکتا ہے۔ ”حکمت نام ہے قول و عمل میں درست کاری اور حق و راستی کی معرفت کا پس اگر یہ معرفت اور درست کاری اشیاء کے پوشیدہ اسرار اور اسباب و مسببات کے باہمی تعلق و ارتباط سے آگاہ کرتی ہے تو اس کو حکمت علمیہ کہتے ہیں۔“

اس پوری حقیقت کو قرآن عزیز نے اپنے مجزا نہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

سپر دقلم کر دیا ہے جو انسانی سعادت کے انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں اور دنیوی و اخروی دونوں زندگیوں سے متعلق ہے۔

اس کتاب کا ایک حصہ ”علم الاخلاق“ سے متعلق ہے جس میں اخلاق کے علمی نظریوں اور عملی درست کاریوں کو بہترین طرز نگارش کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

دوسری کتابوں میں جب آپ ”علم الاخلاق“ کے ان مباحث کا مطالعہ کریں گے جن میں ”علم الاخلاق“ کا دوسرے علوم سے تعلق پر بحث کی گئی ہے تو تمام علماء اخلاق اور حکماء فلاسفر کو اس پر متفق پائیں گے کہ وہ اس سلسلہ میں علم مابعد الطبیعیہ (میانفزیکس) فلسفہ طبیعی (فزیکس) علم الارقاء (ایویوشن) علم النفس (سایکالوجی) علم المنطق (لابک) جمالیات (ایسٹھٹک) فلسفہ قانون (فلاسی آف لاء) علم الاجتماع (سوشیالوجی) اور فلسفہ تاریخ (فلاسی آف ہسٹری) کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں کرتے کہ ”علم الاخلاق“ کا کوئی تعلق اجتماعی علم المعیشت سے بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس طرح کا ہے۔

ارسطو کی کتاب الاخلاق، فلسفہ اخلاق میں ابن مسکویہ کی کتاب السعادة اور تہذیب الاخلاق، ماوردی کی ”ادب الدنیا والدین“ غزالی کی احیاء العلوم، راعب کی الذریعہ، ابن قیم کی مدارج السالکین اور اسی قسم کی دوسری اخلاقی کتابوں میں کسی جگہ اس کا ذکر نہیں ملتا، مشہور حکماء و فلاسفر اور علماء اخلاق کے تمام مباحث اخلاق کو غور و خوض سے مطالعہ کرنے کے باوجود اس سلسلہ میں ناکامی کے سوائے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا، چنانچہ قدیم علماء و حکماء مثلاً ارسطو، افلاطون، سقراط، منکھ ہندی، رواقی، ایتھورکین، کندی، فارابی، ابن سینا، غزالی، ابن بلجہ، ابن طفیل، ابن رشد، ابن خلدون، ابن یثم، ابن عربی، ابن مسکویہ اور اخوان الصفاء کے بیان کردہ اخلاقی نظریے جس طرح اس مسئلہ میں تہی دامن ہیں اسی طرح جدید علماء اخلاق، مثلاً کاؤنٹ، اپنسر، شوپنہار، ویکٹ فرناوی، بنتھم اور جون اسٹورٹ مل، سنیوزا، جریں، ہیگل کے حکمت و فلسفہ کے تمام اخلاقی نظریے بھی اس سوال کے جواب میں داماندہ و بیچارہ نظر آتے ہیں۔

حالانکہ جرمن فلاسفر آگسٹ کسٹ اور کاؤنٹ اور انگریز فلاسفر

مطابق رکھتے اور کس طرح کائنات کے انفرادی و اجتماعی نظام کے لئے باعث فلاح و سعادت ہیں۔
دینی فلاسفر و حکماء

اسلام میں سرتاج انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فلسفہ و حکمت کے اس خاص شعبہ ”علم الاسرار“ کا معلم اول عمر بن الخطاب (فاروق اعظم رضی اللہ عنہ) ہے اور معلم ثانی علی ابن ابی طالب (حیدر کرار رضی اللہ عنہ) کو سمجھا جاتا ہے، عورتوں میں یہ سعادت سب سے پہلے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حصہ میں آئی۔

اس کے بعد اسلامی گہوارے میں بہت سی ماؤں نے ایسے بچوں کی پرورش کی جو غزالی، قشیری، رازی، ابن تیمیہ، ابن قیم اور احمد سرہندی، بن کر اس فلسفہ و حکمت کے امام کہلائے۔
حکیم الامتہ امام ولی اللہ دہلوی

لیکن بارہویں صدی ہجری کے شروع میں یوپی کے غیر معروف قصبہ پھلت میں معلم اول حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی نسل سے ایک بچہ نے عالم وجود میں قدم رکھا اور والدین کی جانب سے اگرچہ اس کو احمد سے موسوم کیا گیا لیکن اپنے فطرت کمالات اور ”علم اسرار و حکمت“ کی امامت کبریٰ نے اس آفتاب حکمت کو دار السلطنت دہلی میں ولی اللہ کے لقب سے مشہور کیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ فیلسوف امت ”ولی اللہ دہلوی“ نے حکمت ربانی اور فلسفہ الہی کا جو اسلوب قائم کیا وہ اپنے تمام پیش روؤں سے زیادہ ممتاز اور اپنی حیثیت سے بہت زیادہ وقیع ہے یہی نہیں بلکہ تمام اسلامی وغیر اسلامی حکماء فلاسفر کے نظریہ اخلاق میں وہ حقیقت مفقود نظر آتی ہے جو اسی حکیم و فیلسوف کے یہاں بدرجہ کمال پائی جاتی ہے۔

حکیم الامتہ کا نظریہ اخلاق

شاہ ولی اللہ بہت سی پر عظمت کتابوں کے مصنف ہیں جو مختلف علوم و فنون کا نادر ذخیرہ ہیں، مگر ان کی تصنیفی زندگی کا شاہکار ”حجتہ اللہ البالغہ“ ہے، یہ کتاب علوم عقلیہ و نقلیہ کا بیش بہا گوہر اور انمول موتی ہے ”علم الاسرار“ و ”حکمت ربانی“ کے پیش نظر شاہ صاحب نے اس میں وہ سب کچھ

ہر برت اسپنر تو ان مشاہیر فلاسفوں میں سے ہیں جنہوں نے ”علم الاخلاق“ کے ساتھ علم الاجتماع اور علم الارقاء کو منطبق کرنے کے لئے بہت سے جدید اور وسیع نظریوں سے کام لیا ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کی بھی پرواز خیال اس رفعت و بلندی تک نہ پہنچ سکی جو ”ولی اللہ دہلوی“ کے حصہ میں آئی۔

متاخرین علماء اخلاق عارف رومی، سعدی، اور شیخ سرہندی نے اخلاقیات پر بہت کچھ کہا اور خوب کہا اگر دنیا کے اجتماعی اخلاق کی برتری یا بربادی پر جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہے اور ہوتی رہی ہے یعنی ”اجتماعی اقتصادیات“ اس کا نشان یہاں بھی نہیں ملتا۔

غرض ”ولی اللہ دہلوی“ کی مشہور کتاب ”حجۃ اللہ البالغہ“ وہ پہلی کتاب ہے جس نے ہم کو اس بیش قیمت علمی نظریہ سے روشناس کرایا کہ اجتماعی علم اخلاق کی فلاح و سعادت اجتماعی معاشیات کے عادلانہ نظام پر موقوف ہے اور یہ کہ دنیا کی قوموں کا اجتماعی اخلاق اس وقت تک صحیح اور بہتر نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کے درمیان ایک ایسا اجتماعی، اقتصادی نظام قائم نہ ہو جائے جو افراط و تفریط سے پاک عادلانہ اصول رکھتا ہو۔

امام الحکیمہ ”ولی اللہ“ کے علاوہ تمام علماء اخلاق ”جدید ہوں کہ قدیم“ یہ سمجھتے رہے ہیں کہ قوموں کے اجتماعی اخلاق کو ”حسین“ بنانے کے لئے عمدہ اخلاقی نظریوں کے غازہ کی ضرورت ہے اس لئے انہوں نے جدید علم اخلاق کو علم الاجتماع پر منطبق کرنے کی زبردست کوشش کی ہے مگر ان تمام علماء سے جدا ولی اللہ دہلوی نے یہ دعویٰ کیا کہ ”اجتماعی اخلاق“ کا حسن اس وقت تک نہیں نکھر سکتا جب تک کہ اقوام کے اجتماعی جسم کو فاسد معاشی نظام کے جذام سے صحت نہ ہو جائے، اگر یہ ہو جائے تو پھر اجتماعی اخلاقیات کا تازہ خون خود بخود جسم اقوام میں دوڑنے لگے گا اور اس کے حسن و زیبائش کیلئے کسی خارجی پوڈر اور غازہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اجمال کی تفصیل :- اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ علماء اخلاق کے نزدیک یہ تسلیم شدہ مسئلہ ہے کہ علم اخلاق کا علم الاجتماع کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اور وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں۔

”انسان کی زندگی اجتماعی زندگی کے بغیر ناممکن ہے لہذا وہ

ہمیشہ کسی نہ کسی جماعت کا فرد ہو کر ہی زندہ رہ سکتا ہے اور یہ ہماری قدرت سے باہر ہے کہ ہم کسی ایک فرد کے فضائل سے اس طرح بحث کریں کہ جس جماعت کی جانب وہ منسوب ہے اس سے بالکل قطع نظر کر لیں اس لئے کہ اس کے بغیر ہم یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ جس جماعت سے اس کا تعلق ہے اس کے اندر وہ کون سے اوصاف ہیں جن سے فضائل و محاسن اخلاق میں مدد ملتی یا رکاوٹ پیدا ہوتی ہے؟

حقیقت حال یہ ہے کہ انسان نہ صرف کسی ایک بلکہ بہت سے روابط کے ساتھ ناگزیر طور پر مربوط ہے اور اس طرح وہ اپنے کنبہ کا بھی عضو ہے، شہر و قریہ کا بھی قوم کا بھی فرد ہے اور پھر تمام انسانی دنیا کا بھی۔

ان حقائق کے پیش نظر انفرادی اخلاق کا تعلق اجتماعی اخلاق کے ساتھ ایک ناگزیر امر ہے اور اگر یہ صحیح ہو تو پھر بلاشبہ علم الاخلاق کا تعلق علم الاجتماع کے ساتھ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور شاہ ولی اللہ نے خصوصیت کے ساتھ ”بحث ارتقا قات“ کے عنوان سے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

پس اس ”مسئلہ“ عقیدے نے ”انفرادی اخلاق“ کے مقابلہ میں ”اجتماعی اخلاق“ کی برتری پر مہر تصدیق ثبت کر دی، اور یہ واضح کر دیا کہ حیات انسانی میں اجتماعی اخلاق کی قیمت بہت زیادہ ہے کیونکہ اس کی افادیت بہت زیادہ ہے۔

لیکن ”علماء اخلاق“ میں یہ اختلافی مسئلہ ہے کہ ”اجتماعی اخلاق“ میں سے کس خلق کو شرف اور برتری حاصل ہے، کتب اخلاق میں اس بحث کو ”فضیلت“ کے باب میں بیان کیا جاتا ہے اور اس میں، سقراط، ارسطو، فلاطون، ابن مسکویہ، اور دور حاضر کے علماء اخلاق کے مباحث کو تفصیل سے نقل کیا گیا ہے۔ ان مباحث کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سقراط ہر شے کی صحیح معرفت، کوسب سے بڑی فضیلت تسلیم کرتا ہے، ارسطو نظریہ ”اوساط“ کا قائل ہے یعنی ہر دور ذائل کے درمیان ایک فضیلت پوشیدہ ہے۔ فلاطون کبھی اپنے استاد سقراط کی تقلید کرتا نظر آتا ہے اور کبھی خواہشات

کے ساتھ ایک عادل اور پرازخیز نظام قائم ہو جاتا ہے دراصل یہ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کا نام ہے جس سے ایسے لطف افکار کلیہ اور سیاسیات عالمہ پھوٹ نکلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے عالم روحانیت کے نزدیک ٹھیک اور مناسب ہوں۔ اور فیوض الحرمین میں خلق حسن ”سمت صالح“ کی بحث میں تحریر فرماتے ہیں۔

”اخلاق انسانی میں ایک خلق کا نام ”سمت حسن“ (نیک سرشت) ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے نفس ناطقہ ان اعمال و اخلاق میں بیداری اور توجہ کامل حاصل کر لیتا ہے جو اس کے اور خدا کے درمیان اور اس کے اور خدا کے تمام مخلوق کے درمیان وابستہ ہیں اور ایسے ”نظام صالح“ کی جانب راہ پا جاتا ہے جو رضاء الہی کا نشا ہے۔“

معیشت کا نظام اور علم الاخلاق

اس طویل بحث کو اب اس طرح ترتیب دیجئے کہ ”انسان“ اگر اخلاق کریمانہ سے متصف نہیں ہے تو پھر وہ جو انوں اور چوپاؤں سے بھی بدتر ہے اور اس آیت کا مصداق ہے۔

لہم قلوب لا یفقہون بہا ولہم اعین لا یبصرون
بہا ولہم اذان لا یسمعون بہا اولئک کالا نعام
بل ہم اضل اولئک ہم الغافلون (الاعراف)
ان کے دل ہیں پر سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں پر دیکھتے
نہیں ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں، چوپاؤں کی
طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں، یہی ہیں جو
غفلت سے سرشار ہیں۔

اخلاق میں انفرادی اخلاق سے زیادہ اجتماعی اخلاق کا مرتبہ ہے، قرآن عزیز نے اگرچہ جدا جدا ہر ایک قسم کے اخلاقی اصول بیان کئے ہیں لیکن جس آیت کو جامع اخلاق کہا گیا اس میں ان ہی اخلاق کریمانہ کا ذکر ہے جو اجتماعی اخلاق کہلاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربی
”بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے عدل کا احسان کا اور قرابت

نفس پر ”ضبط اور کنٹرول“ کو سب سے بڑی فضیلت شمار کرتا ہے۔ ابن مسکویہ ارسطو کی تائید میں مصروف ہے اور دور حاضر کے علماء فضائل اجتماعیہ کو بغیر کسی برتری اور فضیلت کے مختلف اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن ولی اللہ دہلوی نے اصول اخلاق کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ”اجتماعی اخلاق“ کیلئے صرف ایک ہی فضیلت کو اصل،

اور ”معیار“ قرار دیا ہے۔ اور وہ ”عدل“ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

”عدالت ہی ایک ایسی اساس ہے کہ جب انسانی اطوار زندگی مثلاً نشست و برخاست، خواب و بیداری، رفتار و گرفتار اور شکل و لباس وغیرہ میں اس کا لحاظ کیا جائے تو اس کو ”ادب“ کہتے ہیں اور جب مالی حیثیت یعنی جمع و خرچ سے متعلق امور میں اس کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا نام ”کفایت“ ہے اور اگر تدبیر منزل میں اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ آزادی (سول لبرٹی) کہلاتی ہے اور اگر تدبیر مملکت میں اس کو بنیاد بنایا جائے تو اسکو ”سیاست“ کہا جاتا ہے اور اگر اس کو باہمی اخوت و محبت اور تعلقات میں اساس بنایا جائے تو اسی ”عدل“ کو حسن معاشرت کا نام دیا جاتا ہے۔“

اجتماعی اخلاق میں ”عدل“ کی حیثیت کو جس طرح شاہ صاحب نے ظاہر فرمایا ہے ”علماء اخلاق“ کے لئے یہ ایک ایسا بہترین نظریہ ہے جو ”فضیلت“ سے متعلق قدیم و جدید تمام مباحث کے اختلاف کے لئے ایک ”حاکمہ“ اور فیصلہ کن مسئلہ کی طاقت رکھتا ہے اور اس سے اجتماعی اخلاق میں ”عدل“ کی برتری کے ساتھ ساتھ وہ تمام مشکلیں بھی حل ہو جاتی ہیں جو ”فضیلت“ کی بحث میں علماء اخلاق کے سامنے رونما ہیں۔

عدل کا تعلق نظام انسانی سے

فیلسوف امتہ ”شاہ ولی اللہ“ اجتماعی اخلاق میں ”عدل“ کو یہ حیثیت کیوں دیتے ہیں اس کا جواب خود انہوں نے ”عدالت“ کی تعریف کرتے ہوئے دیا ہے۔ حجۃ اللہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

”عدالت ایک ایسے ملکہ کا نام ہے جس کے ذریعہ سے تدبیر منزل، سیاست مملکت اور اسی قسم کے اجتماعی معاملات کے لئے سہولت اور آسانی

و عادل نظام“ کی صلاحیت کو جس اصل اور ناموس پر قائم کیا ہے وہ ان ہی کا طغرائے امتیاز ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

”جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی بنا لیا اور آخرت تک کو بھلا دیا اور شیطان نے ان پر غلبہ کر لیا تو اب ان کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور ان میں کا ہر شخص سرمایہ داری اور تمول پر فخر کرنے اور اترانے لگا، یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے جو بیجا عیش پسندوں کو داد عیش دینے کے لئے عیش پسندی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامان عیش مہیا کرنے کے لئے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور تکیہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور قوم کے اکابر اس جدوجہد میں مشغول نظر آنے لگے کہ اسباب تعیش میں کس طرح وہ دوسرے پر فائق ہو سکتے اور ایک دوسرے پر فخر و مباحثات کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے امراء اور سرمایہ داروں کے لئے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پلنگہ یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو یا ان کے پاس عالیشان سر بفلک محل نہ ہوں جس میں پانی کے حوض، سرد گرم حمام، بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زائد نمائش کے لئے بیش قیمت سواریاں حشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں اور صبح و شام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں اور جام و سبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جس کا ذکر قصہ طولانی کے مرادف ہو، غرض یہ غلط اور گمراہ عیش ان کے معاشی نظام کا اصل الاصول بن گیا تھا اور کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ یہ صرف نواب اور امراء کے طبقہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ پوری

والوں کے ساتھ حسن سلوک اور داد و بخش کا:-

پھر یہی آیت اس کے لئے بھی فیصلہ ناطق ہے کہ اجتماعی اخلاق میں بھی ”عدل“ کا درجہ بلند و بالا ہے اس لئے کہ ”عدل“ ہی سے احسان تک رسائی ہوتی ہے اور ”عدل“ ہی ”ایماء ذی القربی“ کی توفیق بخشتا ہے اس لئے آیت میں اس کو اولیت کا شرف بخشا گیا۔ پھر ”عدل“ ہی اس چیز کو منصفہ شہود پر لاتا ہے جو اجتماعی اخلاق بلکہ اجتماعی حیات کا مدار ہے، یعنی ”نظام صالح“ بلاشبہ یہ ایک محور و مرکز ہے اور تمام اجتماعی مسائل اسی کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ صرف اسی کے وجود سے اجتماعیات کا وجود ہے اور اسی کے فساد و فنا میں اجتماعیات کا فساد و فنا مضمر ہے۔

الحاصل ان ہر سہ درجات و منازل کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عادل و صالح نظام کی صلاحیت اور اس کا فساد کسی شے کے ساتھ وابستہ ہے؟ یہ بظاہر ایک بہت معمولی سوال ہے لیکن اپنی حقیقت کے پیش نظر بہت اہم اور اجتماعی حیات پر بہت زیادہ اثر انداز ہے۔ ارسطو کی کتاب الاخلاق اس کا جواب صرف یہ دیتی ہے کہ ”صالح نظام“ کا وجود ”حصول سعادت“ پر موقوف ہے جو اخلاقیات کے لئے ”مثل اعلیٰ“ ہے۔ لیکن ”سعادت“ کس طرح ہم کو ایک مکمل اجتماعی صالح نظام تک پہنچاتی ہے۔ اس کا جواب ارسطو کے پاس نفی میں ہے البتہ وہ ”علم الاخلاق“ سے الگ ہو کر اس کا جواب سیاسیات میں دینے کی سعی کرتا ہے اور اس طرح ”نظام اجتماعی“ کو اخلاق سے جدا کر دیتا ہے۔

سقراط اور افلاطون کے یہاں بھی یہی حال نظر آتا ہے اور اسی طرح ان کے تبعین مسلمان فلاسفوں اور حکماء کا حال ہے۔ ابن سینا، فارابی، ابن مسکویہ، ابن رشد، اس سلسلہ میں یہ سب اسی اسکول کو مانتے چلے آتے ہیں جس کی طرح یونانی فلاسفوں نے ڈالی تھی۔ امام غزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن عربی اور رومی اگرچہ اخلاقیات میں ایک مستقل اسکول رکھتے ہیں اور ان کے لئے بہترین نوامیس قائم کرتے ہیں تاہم اس سوال کے جواب میں ”عدل“ تک پہنچ کر وہ بھی خاموش ہو جاتے ہیں اور ان کا فکر اس سے اوپر پرواز کرنے کو تیار نظر نہیں آتا۔ لیکن اس سوال کا جواب امام الحکمت ”ولی اللہ دہلوی“ کے پاس موجود ہے اور بلاشبہ انہوں نے ”صالح

مملکت میں ایک عظیم الشان آفت اور وبا کی طرح سرایت کر گیا تھا اور عوام و خواص سب میں یہی جذبہ فاسد پایا جاتا تھا اور ان کے معاشی نظام کی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری تھی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا، ناامیدی، کاہلی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج و غم اور آلام و مصائب میں گھری نظر آتی تھی، اس لئے کہ ایسی مفرطانہ عیش پرستی کے لئے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی البتہ اس کے لئے پادشاہ، نواب اور امراء اور حکام نے معاشی دست برد شروع کر دی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کارپردازوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے ان کی کمر توڑ دی اور انکار کرنے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دی اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آپاشی اور بل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ اور پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق بھی کچھ پیدا کر سکیں خلاصہ یہ کہ ظلم و بداخلاقی کی انتہا ہو گئی تھی۔ اس پریشان حالی افلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اپنی آخری ذی سعادت و فلاح اور خدا سے رشتہ و بندگی جوڑنے کے لئے بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ اور اس ”فاسد معاشی نظام“ کا ایک کمرہ پہلو یہ بھی تھا کہ جن صنعتوں پر نظام عالم کی بنیاد قائم ہے وہ اکثریت قلم متروک ہو گئیں اور امراء و رؤساء کی مرضیات و خواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بہتر خرفہ شمار ہونے لگا۔ اور جمہور کی یہ حالت تھی کہ ان کی تمام زندگی بداختلاقیوں کا نمونہ بن گئی تھی اور ان میں سے اکثر کا گزارہ بادشاہوں کے خزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو گیا تھا مثلاً ایک طبقہ جہاد کے بغیر باپ دادا کے نام پر مجاہدین کے

حرفہ

دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو۔ اس لئے کہ بیکسانہ اور مجبورانہ افلاس سوء تدبیر اور مزاج کے اختلال کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نظام معیشت میں دولت و ثروت ایک بدترین چیز ہے جبکہ وہ باہمی مناقشات اور بغض و حسد کا سبب بنتی اور خود اہل دولت و ثروت کے اطمینان قلب کو تعب اور حریصانہ کد و کاوش کے زہر سے مسموم کرتی ہو اور قوموں کو استحصال بالجبر اور دوسروں پر معاشی دستبرد کے لئے آمادہ کرتی ہو کیونکہ اس صورت میں یہ بداخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتی، آخرت اور یاد الہی یعنی روحانی زندگی سے یکسر غافل و بے پروا بنا دیتی اور مظلوموں پر نت نئے مظالم کا دروازہ کھولتی ہے۔ لہذا پسندیدہ راہ یہ ہے کہ دولت و ثروت ”نظام معیشت“ میں ایسا درجہ رکھتی ہو جو توسط اور اعتدال پر قائم اور افراط و تفریط سے پاک ہو۔ اور یہ صحیح معاشی نظام کے بغیر ناممکن ہے۔“

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:-

اور یہ واضح رہے کہ اگر کسی شہر میں مثلاً دس ہزار انسان آباد ہوں تو ”سیاست مدن“ کے پیش نظر اہل ضروری ہے کہ ان کی صنعت و حرفت اور کسب و تجارت پر بحث کی جائے اور ان کے معاشی مسائل کو زیر بحث لایا جائے۔

سو اگر اہل بلدہ صرف شہری سیاست ہی کے دلدادہ ہیں اور ان میں صنعت و حرفت کا تو شوق ہے مگر وہ زراعت اور مویشیوں کی نگہداشت اور ترقی کی جانب سے بالکل بے پرواہ ہیں تو ان کی دنیوی ترقی خسارہ میں ہے۔ اور اگر عیش پسندی میں غرق ہیں، نئی نئی قسم کی شرابوں کی ایجاد اور بت گری کے ذریعہ معاشی اور بت پرستی کی ترغیبات کے سامان مہیا کرتے ہیں اور جسموں اور اسٹیجوں بنا کر بالواسطہ بت پرستی کے مشاغل کو قوت پہنچاتے ہیں تو یہ ان کی دینی ہلاکت و تباہی کا پیش خیمہ ہے۔

اس کے برعکس اگر اہل بلدہ صنعت و حرفت، تجارت، زراعت شہری سیاست اور اس قسم کے معاشی و سیاسی امور میں ایسے طریق کار پر گامزن ہیں جو ”حکمت“ کے اصول پر مبنی ہے اور مناسب پیشوں کی ترویج کا باعث ہے

سونے چاندی کے زیورات اور حریر و دیا کے نازک کپڑوں کا استعمال اور تمام انسانی نفوس کیلئے خواہ مرد ہو یا عورت ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال اور عالیشان کوشکوں اور رفیع الشان محلات و قصور کی تعمیر اور کانوں میں فضول زیبائش و نمائش وغیرہ کہ یہی فاسد نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی کا منشاء و مولد ہیں۔

بہر حال خدائے تعالیٰ نے اس ہستی کو اخلاق کریمانہ اور نیک نہادی کا معیار اور ان پاک امور کیلئے میزان بنا دیا۔ اسی طرح شاہ صاحب ”ارتقاات“ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

”یہ واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا منشاء اگرچہ بالذات عبادات الہی سے متعلق ہے مگر عبادات کے ساتھ ساتھ اس منشاء میں رسوم فاسد کو فنا کر کے اجتماعی زندگی میں بہترین نظام کا قیام بھی شامل ہے۔ اسی لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے“

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔

اور اسی لئے اس مقدس ہستی کی تعلیم میں ”رہبانیت“ کو اخلاقی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ انسانوں کے باہم اختلاط و اجتماع کی زندگی کو ترجیح دی گئی ہے لیکن اس اجتماعیت کا امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ اس کے معاشی نظام میں نہ دولت و ثروت کو وہ حیثیت حاصل ہو جو عجمی بادشاہوں کے یہاں حاصل تھی اور نہ ایسی کیفیت ہو کہ تمدن سے بیزار و ہقان اور وحشی لوگوں کی طرح ان کی معیشت ہو۔ پس اس مقام پر دو متعارض قیاس کام کر رہے ہیں ایک یہ کہ نظام معیشت میں دولت و ثروت ایک محبوب و محمود شے ہے اس لئے کہ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہے تو اس کی بدولت انسانوں کا دماغی توازن، اعتدال پر رہتا، اور اس سے ان کے اخلاق کریمانہ صحیح اور درست رہتے ہیں۔ نیز انسان اس قابل بنتا ہے کہ

حرفے اور پیشے میں یعنی زراعت، تجارت اور مفید صنعت و حرفت، ان کے لئے ماحول تنگ ہو جاتا ہے اور ان کے لئے راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ بلکہ ان پر محاصل اور ٹیکس کا اس قدر بار بڑھ جاتا ہے کہ کسی طرح وہ فروغ نہیں پاسکتیں اور یہ مضرت آہستہ آہستہ ”خارش کی وبا“ کی طرح تمام افراد میں سرایت کر جاتی ہے اور معاشی نظام اور مدنی مصالح کو گھن لگ کر دنیوی زندگی کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے اور روحانی کمال اور

اخروی زندگی پر اس قدر بڑا اور مہلک اثر پڑتا ہے کہ ناقابل بیان ہے۔ یہی مہلک جراثیم تھے جو عجم و عرب کے جسم تمدن و معیشت میں پیدا ہو کر اس کی دنیوی اور اخروی صحت و فلاح کو برباد اور ان کی اخلاقی حیات کو تباہ کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں یہ التقاء کیا کہ وہ اس مہلک مرض کا علاج کریں اور عجم و عرب کو تباہی اور ہلاکت سے نجات دیں اور علاج کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ مرض کی صرف اصلاح کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اس فاسد مادہ کا ہی قلع قمع کر دیا جائے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے جو ان مہلک اثرات کا باعث ہو۔

پس ذات قدسی صفات نے اسی مصلحت کے پیش نظر اس قسم کے تمام معاشی اور تمدنی نظام کو ممنوع قرار دیا جو اس مرض کے پیدا ہونے کا سبب تھا۔ مثلاً رقص و سرود کی تعلیم، مردوں کے لئے حریر و دیباچ اور اسی قسم کے ریشمیں نازک لباس، سونے چاندی کی ایسی تجارت جو سود و ریا کا موجب بنتی ہو اور سود و قمار وغیرہ۔

شاہ ولی اللہ کے اس نظریہ کی صداقت کیلئے پرانی تاریخوں کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں۔ موجودہ یورپین حکمرانوں کی تاریخ ہی اس کیلئے زندہ شہادت ہے۔

کیا آپ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ جہاں تک انفرادی اخلاق کا تعلق ہے بعض یورپین اقوام اخلاقی مسائل میں بلند اخلاق اور مضبوط کیرکٹر کی حامل نظر آتی ہیں لیکن جب ان کی اجتماعی زندگی پر نظر ڈالئے تو غدر، فریب، بدعہدی، معاشی دستبرد، استحصال بالجبر اور اسی قسم کی بد اخلاقیوں کا سرتاسر مرقع نظر آتی ہیں، وہ معاہدات کرتی ہیں مگر

نیز غیر مناسب اعمال اور شرعی و اخلاقی نقطہ نظر سے فتنج اور بدنتائج کا موجب نہیں ہے تو اہل بلدہ کی دنیوی زندگی بہت خوب اور صحیح و درست ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی پیش نظر رہے گا کہ اگر کسی شہر یا ملک کے ذمہ دار اور سرآوردہ ارکان معتدل معاشی نظام سے الگ ہو کر زیورات کی زیب و زینت، لباس کی نزاکت، عمارت کی بلندی و رفعت، کھانے، پینے کی اشیاء میں مفرطانہ تعیش اور عورتوں کے حسن کو دوبالا کرنے کیلئے خارجی زیبائش کی جانب راغب ہو جائیں اور ضروری حاجات اور مناسب ضروریات کی جگہ مصنوعی تعیش کو اختیار کر لیں جس طرح کہ آج کل عرب و عجم اس میں مبتلا نظر آئے ہیں تو پھر اکثر افراد ملک کا رجحان امور طبعیہ میں تصرف کے ذریعہ بناؤں جگہ گاہٹ پیدا کرنے کی جانب ہو جائے گا تا کہ وہ ملک کے سربرآوردہ افراد کی خواہشات کی تکمیل کر سکیں اور یہی معاش زندگی کا مدار ہو جائے۔

چنانچہ ایک جماعت اگر کینروں کو (اور اس زمانہ میں خود اپنی لڑکیوں کو) رقص و غنا کی تعلیم میں مشغول نظر آتی ہے تو ایک دوسری جماعت لباس میں قسم قسم کے نقش و نگار اور حیوانات و اشجار کی تصاویر کی تزئین کرتی دیکھی جاتی ہے۔

اور ایک تیسری جماعت سونے چاندی اور جواہرات کے زیورات میں بے نظیر کاری اور طرح طرح کی اختراعات اور خارجی زیبائش حسن کے قازوں اور قسم قسم کی صنعتوں میں منہمک رہتی ہے۔

اور ایک چوتھی جماعت عمارتوں کی زیب و زینت، ان کے سرفانہ نقش و نگار، مینا کاری اور چمکی کاری رفیع الشان محلات و قصور کے نئے ڈیزائنوں کی فکر میں مصروف پائی جاتی ہے۔

پس جب کسی ملک یا قوم کا ایک بہت بڑا گروہ اسی قسم کی سرفانہ تعیش پسندانہ صنعتوں میں منہمک ہو جاتا ہے تو پھر وہاں زراعت، تجارت، مفید صنعت و حرفت پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے اور جب قوم کے سرمایہ دارانہ اور مذہب داران کی اپنی پونجی کو ان غیر ضروری اور فضول صنعتوں پر بے دریغ صرف کرنے لگتے اور اپنے رجحان طبع کو اس طرح ضائع کر کے داد تعیش لینے لگتے ہیں تو وہ اپنے ملکی اور شہری مصالح کو برباد کرتے اور صحیح نظام معاشی کو فاسد بناتے ہیں اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو ضروری

تکمیل کیلئے اپنی منشاء و مراد کا آلہ کار بنا دیا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تمام مسلم ممالک پر کفار نے غلبہ کر کے ان کو تہ و بالا کر ڈالا ہے اور یہ دیکھ کر مجھ پر ایک غضب کی سی حالت طاری ہے اور میرے ارد گرد رومی، فارسی، ازبک اور عم و عرب کے مسلمانوں کا جم غفیر جمع ہے کوئی گھوڑے پر سوار ہے تو کوئی اونٹ پر اور کوئی پیادہ اور وہ سب بھی میری طرح کفار کے اس غلبہ پر غضبناک نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرفات کے میدان میں بقصد حج جمع ہیں۔ آخر وہ میری جانب مخاطب ہو کر کہنے لگے ماذاکلم اللہ فی ہذہ الساعۃ (اس حالت کے پہنچ جانے کے بعد اب خدا کا فیصلہ کیا ہے؟) میں نے

جواب دیا کہ کل نظام موجودہ تمام نظامہائے عالم کو درہم برہم کر دینا۔ امام الحکمت ولی اللہ کا اس سے یہ مطلب ہے کہ چونکہ اب عالم میں اسلام کا وہ بنیادی نظام باقی نہیں رہا جس کا جزو اعظم ”صحیح معاشی نظام“ ہے اور جمہور کے امن و اطمینان کا کفیل ہے تو اب تعمیر سے پہلے تخریب ضروری ہے اور اس کے بعد ہی اس عادلانہ نظام کے قیام کی توقع کی جاسکتی ہے۔

امام ابو یوسف نے علم الاسرار کے معلم اول اور شاہ صاحب کے جد امجد حضرت عمر بن الخطاب کا ایک مقولہ کتاب الخراج میں نقل کیا ہے، جو امام الحکمت کے نظریہ کی تائید کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک ذمی یہودی کو بھیک مانگتے دیکھ کر فرمایا:۔

”وہ حکمران خدا کے سامنے سخت مواخذہ میں گرفتار ہوگا جس کی قلمرو میں ایک بھکاری بھی بھیک مانگنے پر مجبور ہو“

الحاصل امام الحکمت شاہ ولی اللہ دہلوی وہ پہلا فلسفی اور علم الاخلاق کا پہلا حکیم ہے جس نے دنیا کے سامنے یہ پیش بہا نظریہ پیش کیا کہ کسی قوم کا اجتماعی اخلاق تک پہنچنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کے نظام حکومت میں ایسا ”عادلانہ معاشی نظام“ قائم ہو اور افراط و تفریط سے الگ عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں فلاح و خیر اور امن و عافیت کا ضامن ہو اور بلاشبہ ولی اللہی حکمت و فلسفہ کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ وہ اخلاقیات کو معاشیات کے ساتھ مربوط کرتی اور ان دونوں کے درمیان لازم و ملزوم کا رشتہ ثابت کرتی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ابدعہدی کے لئے مظالم توڑتی ہیں مگر آئین اور قانون کا نام دے کر، فریب کاریاں کرتی ہیں مگر تدبیر اور سیاست کہہ کر اور معاشی دست بردور رکھتی ہیں مگر تجارت اور تہذیب آموزی کا پردہ رکھ کر حتیٰ کہ انفرادی بد اخلاقیوں میں سے بھی بدکاری، شراب خواری اور معیاشی ان کا مایہ خمیر بن چکی ہے۔

لیکن یہ سب کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ ان کے معاشی نظام کی بنیادیں جمہور کی حاجتوں کے پورا کرنے کے اصول پر استوار نہیں کی گئیں بلکہ اس سرمایہ دارانہ اصول پر قائم ہیں جس کو شاہ ولی اللہ کے نظریہ میں فاسد اور مذموم معاشی نظام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پس جس حکمران قوم کا معاشی نظام رفاہیت کی افراد کا داعی اور معاشی دستبرد کا حامل ہے اس قوم میں کبھی اجتماعی محاسن اخلاق پیدا نہیں ہو سکتے اور وہ قوم ہمیشہ اجتماعی بد اخلاقیوں کا معدن ہوگی، کمزور اقوام کے لئے فتنہ بنے گی اور تکبر، ظلم، حق تلفی، دوسروں کی تحقیر و تذلیل اور خود غرضی و خوشامد پسندی جیسے مکروہ اخلاق اس کی فطرت ثانیہ بن جائیں گی۔

اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو قوم غلامی یا دوسرے اسباب کی بدولت ایسے معاشی نظام سے دوچار ہو جو مفید اور عادلانہ رفاہیت سے خالی اور محروم ہے تو وہ دوسری قسم کی اجتماعی بد اخلاقیوں کا گہوارہ بن جائے گی اور اس میں ذلت نفس، قنوطیت یعنی ناامیدی اور یاس، عجز، بزدلی، افلاس اور گداگری جس بد اخلاقیوں نمودار ہو جائیں گی۔

پس شاہ صاحب کے زیر بحث نظریہ اخلاق کے پیش نظر اجتماعی اخلاق اور عادلانہ معاشی انتظام میں ایسا ملازم ہے جو کسی طرح ایک دوسرے کو جدا ہونے نہیں دیتا اور شاہ صاحب کی نظر میں اجتماعی اخلاق میں حسن و کمال جب ہی پیدا ہو سکتا ہے کہ حکومت کا معاشی نظام ایسے اعتدال پر ہو کہ جس میں بیباکانہ عیش پسندی کا دخل ہو نہ افلاس اور فقر وفاقہ کا اور نہ وہ معاشی دستبرد آئینی استحصال بالجبر پر قائم ہو اور نہ معیشت کے ترقی پذیر ذرائع سے خالی اور محروم ہو۔

حضرت شاہ صاحب فیوض الحرمین میں ایک مکاشفہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

میں نے روایئے صادقہ میں دیکھا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے نظام خیر کی

امام شاہ ولی اللہ اور حنفیت

مولانا محمد یوسف بنوریؒ

ارادہ رکھتا ہوں۔ عصر حاضر کے ذوق کے پیش نظر مجھے کوئی دلچسپ موضوع اختیار کرنا چاہئے تھا مگر مندرجہ ذیل امور نے مجھے عنوان مندرجہ بالا پر اظہار خیال کرنے کے لئے مجبور کیا۔

(۱) حنفیت حقیقت میں ایک شرعی نظام قانون ہے جس کو اصحابِ درایت اور ائمہ مذہب نے نظام عالم کے لئے اصل ترین قانون سمجھا اور آخرت کے لئے ایک نافع ترین ذریعہ نجات و وسیلہ سعادت خیال کیا۔

(۲) ہند اور بیرون ہند کے مخالف تقلید حضرات نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کو بھی امام ابن حزم ظاہری علامہ ابن القیم اور قاضی شوکانی کی طرح عدم تقلید کے لئے ایک رکن رکین سمجھا بلکہ تقلید اور بالخصوص حنفیت کا دشمن ظاہر کیا ہے۔

(۳) حضرت موصوف کی بعض تالیفات میں بعض ایسی عبارات بھی موجود ہیں جن سے ایک سطحی النظر شخص دیانت داری کے ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق یہ رائے قائم کر سکتا ہے۔

اس موقع پر مناسب ہوتا کہ کچھ تفصیلی نظرا اجتہاد و تقلید پر ڈال سکتا تا کہ کسی قدر واضح ہو جاتا کہ حضرت شاہ صاحب مجتہد تھے یا مقلد، لیکن مضمون بہت طویل ہو جائے گا اس لئے اس کے متعلق چند اشارات ہی پر اکتفا کرتا ہوں اور وہ اشارات بھی نہایت مجمل ہوں گے، لیکن انشا اللہ اہل علم کے لئے وہ کافی بھی ہوں گے۔

۱۔ اگر قدامین سے قاضی بکار اور امام تاجاوی اور ابوبکر خضاف اور ابوبکر بھصا، قاضی ابوزید بوسی شمس الائمہ سرخسی وغیرہ وغیرہ اور

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ سرزمین ہند کے ان اکابر میں سے ہیں جن کی نظیر نہ صرف اپنے عصر میں اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بہت سے قرون اور ممالک اسلامیہ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔

حضرت موصوف بقول حضرت حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند ان افراد امت میں سے ہیں کہ سرزمین ہند میں اگر صرف شاہ ولی اللہ ہی پیدا ہوتے تو ہندوستان کے لئے یہ فخر کافی تھا۔

حضرت شاہ صاحب کی زندگی اور علمی و عملی کمالات کے اتنے گوشے ہیں کہ ہر ایک مستقل تصنیف کا محتاج ہے مثلاً حضرت ممدوح کی جامعیت اور تبحر، دقت نظر، ظاہری و باطنی علوم کا حیرت انگیز اجتماع، مکاشفات و کرامات تصنیف و تالیف، ترجمہ قرآن کی بنیاد، نصاب حدیث کی تاسیس، درس کی اصلاح، اسرار شریعت کی دلنشین اور موثر تشریح، کلام تصوف فلسفہ اخلاق اور نظام حکومت میں ان کے خاص خاص قابل قدر نظریات اصول تفسیر و اصول حدیث میں خاص خاص تحقیقات جہاد کا جوش، حکومت اسلامیہ کی خلافت راشدہ کے اصولوں پر تشکیل و تاسیس وغیرہ وغیرہ اتنے کمالات و خصائص ہیں جو اہل نظر و فکر کے لئے اور اہل دل و اہل ذوق ارباب قلم کے لئے کافی جولا نگاہ تحقیق و تدقیق ہیں۔ حضرت موصوف کیا تھے؟ خدائے تعالیٰ کی ایک حجت قاطعہ تھی جو بارہویں صدی میں ہندوستان میں ظاہر ہوئی، میری بساط ہی کیا ہے کہ میں ارباب نظر کے لئے شاہ صاحب کے کمالات کے کسی شعبہ پر ایسا لکھ سکوں کہ حق ادا ہو سکے تاہم حصول سعادت کے لئے ایک موضوع پر کچھ اظہار رائے کرنے کا

بن مہران) کی مجلس میں ایک شخص آیا اور اعمش سے کوئی مسئلہ دریافت کیا آپ کوئی جواب نہ دے سکے، دیکھا کہ امام ابوحنیفہ تشریف رکھتے ہیں فرمایا کہ کہنے نعمان کیا ہے جواب؟ امام ابوحنیفہ نے فوراً جواب دیا، امام اعمش نے پوچھا کہ ابوحنیفہ تم نے کہاں سے یہ جواب دیا ابوحنیفہ نے فرمایا کہ آپ ہی نے تو مجھ سے فلاں حدیث اپنی سند سے بیان کی تھی اسی سے یہ مسئلہ اس طرح نکلتا ہے۔ امام اعمش یہ دیکھ کر بے ساختہ فرمانے لگے۔

نحن الصيادلة وأنتم الأطباء (۱) (ہم تو عطار ہیں طبیب تو آپ لوگ ہیں)

نیز امام ابن عبدالبر اسی کتاب میں نقل فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ اعمش نے امام ابو یوسف سے ایک مسئلہ دریافت فرمایا ابن یوسف نے جواب دیا آپ نے فرمایا یعقوب (امام ابو یوسف کا نام ہے) تم نے یہ کہاں سے کہا؟ فرمایا اس فلاں حدیث سے جو آپ نے ہی مجھ سے فرمائی ہے۔ اعمش فرمانے لگے۔

يا يعقوب اني لاحفظ هذا الحديث من قبل ان يجتمع ابواك ما عرفت تاويله الى الآن. (۲)

یعقوب! یہ حدیث تو مجھے اس وقت سے یاد ہے کہ آپ کے والدین جمع بھی نہ ہوئے ہوں گے لیکن آج تک مجھے اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اور یہ اعمش وہ جلیل القدر امام ہیں جن کے متعلق امام بخاری کے استاد علی بن المدینی فرماتے ہیں۔

حفظ العلم على امة محمد صلى الله عليه وسلم سنة عمرو بن دنيا بمكة والزهرى بالمدينة وابو اسحاق السبيعي والاعمش بالكوفة وقتادة ويحيى بن ابى كثير بالبصرة. (۳)

امت محمدیہ کے لئے چھ محدثوں نے علم محفوظ کیا عمرو بن دینار نے مکہ میں زہری نے مدینہ میں اور ابو اسحاق و اعمش نے کوفہ میں اور قتادہ و یحییٰ بن ابی کثیر نے بصرہ میں۔

۲۔ امام حدیث ابو محمد راہرمزی اپنی کتاب الحدیث القاضی میں

متاخرین میں سے امیر کا تب اتقانی، علا الدین ماردینی، ابن الہمام، ابن امیر الحاج، قاسم بن قطلوبغا وغیرہ مقلد ابوحنیفہ ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ حضرات بھی اپنے خصوصی مختارات رکھتے ہیں تو پھر حضرت شاہ صاحب کا انہی کی طرح حنفی ہونا کیوں مستبعد ہے۔

نیز جب کہ قاضی اسماعیل، حافظ ابن عبدالبر، قاضی ابوبکر بن عربی، حافظ اصیلی، ابن رشد کبیر مالکی ہو سکتے ہیں اور دارقطنی، بیہقی، خطابی، ابوالمعالی، امام الحرمین، غزالی، ابن عبدالسلام، ابن دین العید وغیرہ شافعی ہو سکتے ہیں اور علی ہذا جب کہ ابن جوزی، ابن قدامہ، ابن تیمیہ، ابن قیم وغیرہ حنبلی ہو سکتے ہیں تو پھر اسی درجہ میں حضرت شاہ صاحب کو مقلد مذہب حنفی ماننے میں کیا اشکال ہو سکتا ہے۔

۲۔ اصولاً کسی امام صاحب مذہب کا تتبع چند جزئی مسائل میں اگر اپنے امام کے خلاف رائے قائم کرے تو علماء امت میں اس کو اتباع و تقلید کے منافی نہیں سمجھا جاتا قریباً سب مذاہب کے علماء میں کثرت سے خاص خاص مسائل میں بہت سے اختیارات اپنے ائمہ کے خلاف ملتے ہیں۔

۳۔ پس اگر آپ نے تقلید کے وسیع حدود کو ان اشارات اور امثلہ سے کچھ سمجھ لیا ہے تو پھر حضرت شاہ صاحب کی عبارات و ملفوظات سے یہ سمجھنا آپ کے لئے آسان ہو جائے گا کہ حضرت ممدوح حنفی تھے یا غیر حنفی۔

۴۔ اجتہاد و تقلید کے سمجھنے کے لئے ایک حد تک حضرت شاہ صاحب کی تالیف ”عقد الجدید فی الاجتہاد و التقلید“ عربی میں اور اردو میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی کتاب ”الاقتصاد فی التقلید والا اجتہاد“ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن سرہ کی کتاب ”الایضاح الاولہ کی دفعہ پنجم کافی و شافی ہیں۔

۵۔ ہر محدث کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ فقیہ بھی ہو جیسا کہ ہر فقیہ کا محدث ہونا ضروری نہیں نیز تفقہ کا مرحلہ تحدیث سے کہیں زیادہ مشکل ہے اس کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل دو واقع پیش کرتا ہوں۔

۱۔ حافظ حدیث ابو عمر بن عبدالبر مالکی اندلسی (المتوفی ۴۶۳ھ) اپنی کتاب ”جامع بیان العلم“ میں فرماتے ہیں کہ امام حدیث اعمش (سلیمان

فرماتے ہیں۔

عن انس بن سیرین ^{سیرین} اتیت الکوفة فرأيت فيها اربعة آلاف يطلبون الحديث واربع مائة قد فقهوا. (۴)

انس بن سیرین فرماتے ہیں کہ میں کوفہ آیا اور مشتغلوں بالحدیث چار ہزار پائے اور فقہ صرف چار سو کوآیا تھا۔

اب تو شاید ہر مصنف کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ فقہ کتنی مشکل چیز ہے اور صرف محدث بننے سے فقیہ نہیں بن سکتا اس قسم کے سیکڑوں نہیں ہزاروں واقعات سے اسلام کا علمی ذخیرہ بھرا پڑا ہے اس تمہید کے بعد میں اصلی مقصد کی طرف آ رہا ہوں۔

حضرت شاہ صاحب کا مسلک ان کی تالیفات کی روشنی میں (۱) تہذیبات الہیہ ص ۱۳۸ اور ۱۳۹ میں فرماتے ہیں۔ (۵)

ان تشعب الدين طرقاً ومذاهب وكون الامة فيها احزاباً متحزبة..... امر عظیم ہال خاصتہم وعامتہم فمن اهل الله عن كشف له عن ارتباط كل قول نطق به فقيه من فقهاء الاسلام بالشريعة المحمدية على صاحبها الصلوات والتسليمات ولم يكشف له عن الجادة القويمة التي اقامها الله تعالى لعباده ورضى لهم..... فسكت عن ترجيح بعض الاقوال على بعض وحمل اختلافها على العزيمة والرخصة.

ومن اهل الله من يترأى له الجادة القويمة التي تودى الى ظاهر الشريعة والتي توارثها جماهير المسلمين عن جهابذة التابعين عن كبار الصحابة والتابعين عن النبي صلى الله عليه وسلم كالتناول باليد او لم يتوارثوا عين ذلك ولكنه اشتهى بما توارثوه..... فرأى المتكلم في ترجيح الراجح نصراً للدين وذبا عنه كاكثر الفقهاء والمحدثين فانهم قد بالغوا فيه ومن اهل الله من كشف له عن الامرين فسلمهما كليهما على معنى انهما من دائرة الشرع وان المتعبد بهما في فسحة من دينه متدين لله تعالى

معذور عند غيره وان الفضل للجادة القويمة وهي المرضية عند الله تعالى كل الرضا.

ومن اعظم نعم الله تعالى على ان جعلني من الحزب الثالث وكشف لي عن اهل الشريعة وعن تبيانها الحاصل على لسان النبي صلى الله عليه وسلم ثم عن تبيان تبيانها الحاصل على السنة الصحابة والتابعين ثم عن ايضاحها وتدوين اصولها وفروعها الحاصل على ايدي المجتهدين المتقدمين ثم عن شرح مذاهبهم واقاويلهم والتخريج على قواعدهم الحاصل على ايدي المتأخرين من الفقهاء في كل مذهب، فكشف لي عن كل ذلك بترتيبه الواقع في نفس الامر..... فرأيت كل قول قيل في الدين مرتبطاً باصل الشريعة بواسطة او بغير واسطة.

پھر صفحہ ۵۲، جلد اول میں فرماتے ہیں۔

(۲) فكان من اعظم نعم الله تعالى ان كشف لي عن حقيقة حال المذاهب وحال المتقيد ببعضها وحال من اراد الانتقال الى مذهب بعد ما كان متقيداً بمذهب آخر وحال عن اخذ في بغض المسائل بمذهب وفي البعض الآخر بمذهب آخر، وهل خير الشارع او الزم كل واحد ان يلتزم مذهباً واحداً

پھر صفحہ ۱۵۳، جلد اول میں فرماتے ہیں:-

(۳) وكشف لي ان الاختلاف على اربعة منازل. اختلاف^۱ مردود وليس لقائلة ولمقلده من بعده عذر وهذا قليل الوجود في المذاهب الاربعة المدونة، واختلاف^۲ لقائله عذر مالم يبلغه حديث صحيح دال على خلافه فاذا بلغه فلا عذر له، واختلاف^۳ مقبول قد خير الشارع المكلفين في طرفيه تخبيراً ظاهراً مطلقاً كالأحرف السبعة من القرآن واختلاف^۴ ادر كنا كون طرفيه مقبولين اجتهاداً واستنباطاً من بعد كلام الشارع صلوات الله وسلامه عليه

طلب منى التعبد به بخلاف نفسى.

پھر اسی کے صفحہ ۱۰۳ میں فرماتے ہیں:-

(۷) اعلم ان الملل والمذاهب توصف بالحقیة

بالمعینین احدهما جبلی والآخر دقیق یدی من بعد

وكذلك معنى حقیة المذهب ان يكون احكامه مطابقة لما

قاله رسول الله صلى الله عليه وسلم فى نفس الامر ولما

كان القرون الشهود لها بالخیر، وان كانت المسألة لانص

فيها ولا رواية محقیة ان تكون محفوفة بقرائن تورث

غالب الظن بان النبى صلى الله عليه وسلم لو تكلم فى

المسألة لما نطق بغير هذا

ربما يكون العناية المتوجهة الى حفظ ملة حقة متوجهة الى

حفظ مذهب خاص بأن يكون حفظة المذهب يومئذ هم

القائمون بالذب عن الملة وهذا المعنى الدقیق لا یوقف

عليه الا بالنور النبوی

فنقول تراى لى ان فى

المذهب الحنفى سراغاً مضام لم ازل اتحدق فى هذا السر

الغامض حتى شاهدت ان لهذا المذهب يومنا هذا رجحانا

على سائر المذاهب بحسب هذا المعنى الدقیق.

اور حجۃ اللہ صفحہ ۱۵۲ میں فرماتے ہیں:-

(۸) ومما یناسب هذا المقام التبیہ على مسائل ضلت

فى یوادیهها الافهام وذلت الاقدام وطعنت الاقلام منها ان

هذه المذاهب الاربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الامة

او من یعتدبه منها على جواز تقلیدها الى یومنا هذا وفى

ذلك كله من المصالح مالا یخفى لا سیما فى هذه الایام

التى قصرت فیها الهمم جدا و اشربت النفوس الهوى

واعجب كل ذی رأى برأیت فما ذهب الیه ابن حزم حیث

قال التقلید حرام ولا یحل لاحد ان یأخذ قول احد غیر

رسول الله صلى الله عليه وسلم بلا برهان

انما یتم فمن له ضرب من الاجتهاد ولو فى مسألة واحدة

والانسان مکلف به لا مطلقاً بل یشترط الاجتهاد

وتأكد الظن وتقلید من حصل له ذلك.

اور فیوض الحرمین صفحہ ۶۲ میں فرماتے ہیں:-

(۳) سألته صلى الله عليه وسلم سوا لاروحانياً فنفتح

الى نفخة

ونفخ نفخة اخرى فبین ان مراد الحق

فیک ان یجمع شملاً من شمل الامة المرحومة بك،

فاک ان تخالف القوم فى الفروع فانه مناقضة لمراد الحق

ثم كشف انموذجاً ظهر لى منه كيفية تطبيق السنة بفقہ

الحنفية من الاخذ بقول احد الثلاثة وتخصیص عموماتهم

والوقوف على مقاصدهم والاقتصار على ما يفهم من لفظ

السنة وليس فيه تاویل بعيد ولا ضرب بعض الاحادیث

بعضاً ولا رفضاً لحديث صحيح بقول احد من الامة وهذه

الطريقة ان اتمها الله واكملها فهى الكبریت الاجر

والاكسير الاعظم

پھر صفحہ ۲۸ میں فرماتے ہیں:-

(۵) عرفنى رسول الله صلى الله عليه وسلم فى

المذهب الحنفى طريقة ائنة هى اوفق الطرق بالسنة

المعروفة التى جمعت ونفخت فى زمان البخارى واصحابه

وذلك ان یؤخذ من اقوال الثلاثة قول اقربهم بها فى

المسألة ثم بعد ذلك یتبع اختیارات الفقهاء الحنفیین

الذین كانوا من علماء الحديث (۶) قرب شیء سکت عنه

الثلاثة فى الاصول وماتعرضوا النفيه ودلت الاحادیث علیه

فليس بد من اثباته والكل مذهب حنفى.

پھر صفحہ ۶۳-۶۵ میں فرماتے ہیں:-

(۶) واستفدت منه صلى الله عليه وسلم ثلاثة امور

خلاف ما كان عندى

وثانیه الوصاة

بالتقلید بهذه المذاهب الاربعة لا اخرج منها، والتوفیق ما

اسطعت وجبلى تأبى التقلید وتائف منه رأساً لكن شیء

ودائماً تفریعات فقیہ بر کتاب وسنت عرض نمودن آنچه موافق باشد در چیز قبول آوردن والا کالائے بد بریش خاوند دادن الخ
نیز ای تہیمات صفحہ ۱۱۸ جلد ۲ میں فرماتے ہیں:-

(۱۳) فاذا رفع اليه قضية فله ان يجتهد فيها بدأيه ويتحرى الصواب فان كان قد سبق فيها حكم لجماعة فعليه ان لا يجاوزه وهي القياس والاجماع الخ

(فائدہ) اس عبارت سے ایک خاص بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک جو اہل اجتہاد بھی ہو اگر اس کے سامنے بھی کوئی ایسا نیا قضیہ پیش کیا جائے کہ علماء سابقین کا اس کے متعلق کوئی حکم موجود ہو تو اس سے تجاوز نہ کرے۔

نیز اسی صفحہ میں فرماتے ہیں۔ واذا تحمل رجل امرأ ووافق ظنك ثلاثا تجاوز عنه وهو الاجماع وليلا خانيا ولا قياس ولا اجماع في ماسوى ذلك

اور اسی تہیمات کے صفحہ ۲۱۵ جلد ۱ میں فرماتے ہیں:-

(۱۵) وان قصرت افهامكم فاستعينو برأى من مضى من العلماء ما تروه احق واصرح ووافق بالسنة.

اور حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۰، ۱۱ جلد ۱ میں حضرت شاہ صاحب اپنے مسلک کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں فرماتے ہیں:-

(۱۶) وها انا يرينى من كل مقالة صدرت مخالفة الدينية من كتاب الله او سنة قائمة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم او اجماع القرون المشهود ولها بالخير او ما اختاره جمهورا المجتهدين ومعظم سواد المسلمين فان وقع شئى فانه خطأ رحم الله من ايقظنا من سنتنا او بنهنا من غفلتته اما هولاء الباحثون بالتخريج والاستنباط من كلام الاوائل المنتحلون مذهب المناظرة والمجادلة فلا يجب علينا ان نوافقهم فى كل ما يتفوهون به ونحن رجال وهم رجال والامر بيننا وبينهم سجل

ان تمام مذکورہ اقتباسات سے بآسانی ہم عمومی طور پر حسب ذیل

وفيمن ظهر عليه ظهوراً بينا ان النبى صلى الله عليه وسلم امر بكذا ونهى عن كذا وانه ليس بمنسوخ الخ
نیز عقد الجید میں صفحہ ۳۱ سے لے کر دور تک اسی مضمون کو نہایت وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اور حجۃ اللہ صفحہ ۱۵۶ جلد ۱ میں فرماتے ہیں:-

(۹) ومنها ان التخریج على كلام الفقهاء وتبع لفظ الحديث لكل منهما اصل اصیل فى الدين ولم يزل المحققون من العلماء فى كل عصر يأخذون بهما فمنهم من يقل من ذا ويكثر من ذالك فلا ينبغي ان يهمل امر واحد منهما وانما الحق البحت ان يطابق احدهما بالاخر

اور تہیمات الہیہ صفحہ ۲۰۶ جلد ثانی میں فرماتے ہیں:-

(۱۰) ونحن نأخذ من الفروع ما اتفق عليه العلماء لاسما هاتان الفرقتان العظیمتان الحنفية و الشافعية وخصوصاً فى الطهارة والصلاة فان لم تيسر الاتفاق واختلفوا فأنخذ بما يشهد له ظاهر الحديث ومعروفه ونحن لانزدري احدا من العلماء فالكل طالبوا الحق ولا نعتقد العصمة فى احد غير النبى صلى الله عليه وسلم الخ
اور تہیمات الہیہ صفحہ ۲۰۲ جلد ۲ میں فرماتے ہیں:-

(۱۱) لين منا عن لم يتدبر كتاب الله ولم يتفهم حديث نبيه صلى الله عليه وسلم، ليس منا من ترك ملازمة العلماء اعنى الصوفية الذين لهم حظ من الكتاب والسنة او الراسخين فى العلم الذين لهم حظ من التصوف، او المسحدين الذين لهم حظ من الحديث او الفقهاء الذين لهم حظ من الفقه

نیز تہیمات صفحہ ۲۳۰ جلد ۲ میں ایک وصیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:-

(۱۲) ودر فرور و بیروى علماء محدثین کہ جامع باشند میاں فقہ و حدیث

”ومن قال مذهب ابی حنیفہ رحمہ اللہ ترک الاشارة

بالمسبحۃ فقد اخطا ولا یعضدہ روایۃ ولا درایۃ قالہ ابن الہمام نعم لم یذکرہ محمد فی الاصل وذکرہ فی المواظ ووجدت بعضهم لا یمیز بین قولنا: لیست الاشارة فی ظاہر المذہب وقولنا ظاہر المذہب انہا لیست“

یعنی جس شخص نے یہ کہا کہ ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ تشہد میں اشارہ بالسباہ نہ کرنا چاہئے اس نے غلطی کی کیونکہ یہ عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے جیسا کہ ابن الہمام نے فرمایا: ہاں امام محمد نے اس مسئلہ کو مبسوط میں ذکر نہیں کیا (جو ظاہر الروایۃ کی کتابوں میں سے ہے) لیکن مواظ میں اس کو ذکر فرمایا، اور دیکھتا ہوں کہ بعض لوگ فقہاء کی ان دو تعبیروں میں فرق نہیں کر سکتے۔

(۱) اشارہ ظاہر مذہب میں نہیں۔

(۲) ظاہر مذہب یہ ہے کہ اشارہ نہیں۔

حضرت شاہ صاحب کا مسلک

یہ تو شاہ صاحب کی مذکورہ بالا عبارات کے عمومی نتائج یا آپ کے نظریات تھے ان کے علاوہ اپنے اقتباسات سے ہم حضرت شاہ صاحب کے مسلک کے بارے میں خصوصی طور پر مندرجہ ذیل نتائج پر بھی پہنچتے ہیں

۱۔ ائمہ اربعہ کے اختلافات کے بارے میں آپ کی پوری تشریح ہوگئی ہے اور اس کا صحیح منشا بھی سمجھ گئے ہیں۔

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو وصیت فرمائی ہے کہ مذاہب اربعہ کے دائرے سے باہر نہ نکلیں اور جہاں تک ممکن ہو ان میں تطبیق دیں۔

۳۔ آپ کو اپنے طبعی رجحان یا میلان کے خلاف ان مذاہب کی تقلید پر مامور کیا گیا۔

۴۔ آپ کو حکم دیا گیا کہ فروعی مسائل میں بھی ”حنفیہ“ کے خلاف نہ کریں جب تک صراحتہ کسی حدیث کی مخالفت نہ ہو۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنے علم و فہم سے نوازا جس کے ذریعہ ہندوستان میں رائج حنفیت کی اصلاح کر سکیں تمام حنفی علماء کے غلو

نتائج اخذ کر سکتے ہیں:-

۱۔ مذاہب اربعہ کی تقلید کرنا چاہئے بالخصوص شر و فساد کے اس دور اور اتباع ہوی کے اس زمانہ میں اس شخص کے لئے جو براہ راست کتاب و سنت سے استنباط نہ کر سکتا ہو ان مذاہب کی تقلید میں بہت سی مصالحوں ہیں۔

۲۔ کسی فقہی قیاسی مسئلہ میں اگر سلف کا کوئی قول موجود ہو اور اس کے علم میں کسی صحیح حدیث سے مخالف نہ ہو تو اسے ماننا ضروری ہوگا۔

۳۔ اگر ائمہ کے اقوال یا کسی ایک امام کے اقوال میں اختلاف ہو تو جو مسلک کتاب و سنت سے زیادہ قریب ہو اس کو اختیار کرنا چاہئے۔

۴۔ مذاہب اربعہ میں بہت کم ایسا کوئی مسئلہ ملے گا جس کی کوئی دلیل موجود نہ ہو یا اس کے قائل یا اس کے مقلد کو معذور نہ سمجھ سکیں۔

۵۔ غور سے یہی معلوم ہوا کہ حنفی مذہب آج کل باقی مذاہب سے زیادہ بہتر ہے۔

۶۔ حنفی مذہب کی تقلید میں بہترین طریقہ یہ ہے کہ ابوحنیفہ ابو یوسف محمد بن الحسن تینوں ائمہ کے اقوال میں سے اس کو لیا جائے جو حدیث سے زیادہ قریب ہو اور یہ مذہب حنفی کی تقلید کے مخالف نہیں۔

۷۔ صرف حدیث ہی پر قیامت کر کے فقہ سے بے بہرہ رہنا یا صرف فقہ پر کفایت کر کے حدیث سے محروم رہنا یہ غلو ہے افراط و تفریط ہے جو درست نہیں دونوں کو ملانا اور ان میں تطبیق دینا ضروری ہے اور یہی بہترین طریقہ ہے۔

۸۔ کسی دلیل قوی کی وجہ سے اگر کوئی مقلد اپنے امام کا مسلک چند مسائل میں ترک کر دے تو یہ تقلید کے منافی نہیں۔

۹۔ اگر کوئی مسئلہ فقہ حنفی کی کتب ظاہر الروایۃ میں موجود نہ ہو اور حدیث میں مذکور ہے تو اس کو ضرور لینا ہوگا اور یہ مذہب حنفی کی تقلید کے خلاف نہ ہوگا۔

ایک مثال سے یاس کی وضاحت

چنانچہ شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۱ جلد ۲ میں فرماتے ہیں:-

میں شیخ محمد عابد سندھی صاحب ”المواہب اللطیفہ علی مسند ابی حنیفہ“ وطوالع الانوار شرح الدر المختار“ وغیرہ (شیخ محمد ہاشم سندھی، شیخ عبدالغفور سندھی، شیخ محمد قاسم سندھی، شیخ ابوالحسن سندھی اور حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ میں آپ کے جانشین شاہ عبدالعزیز اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور السید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی جو تبحر حدیث وغیرہ میں کچھ کم نہیں۔ سب حنفی المذہب ہی ہیں حضرت شاہ صاحب کے بعد شاہ عبدالعزیز حنفی محدث آپ کے جانشین رہے اور شاہ عبدالعزیز کی جانشینی شاہ محمد اسحاق آپ کے نواسے نے کی اور شاہ اسحاق کے مسند نشین، شیخ عبدالغنی مجددی ہوئے یہ سب بھی حنفی المسلک محدث تھے۔

شاہ صاحب کے فقہی مسلک کے سمجھنے کے لئے آپ کی علمی تاریخ کا پیش منظر ہونا بھی ضروری ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ممدوح نے شروع میں حضرت والد ماجد شاہ عبدالرحیم وغیرہ علماء سے علوم حاصل کئے اور فقہ حنفی پڑھا اور جب تک ہندوستان میں تھے اور حریم شریفین کی زیارت کو نہیں گئے تھے آپ پر فقہ حنفی کا اثر تھا۔ ۱۱۳۳ھ میں جب مدینہ منورہ پہنچے اور شیخ ابوظہر کڑی شافعی سے تلمذ ہوا تو اس کے بعد فقہ شافعی کا اثر بھی ساتھ آتا گیا اور ”کتاب الام“ جو امام شافعی کی کتاب ہے اس کے مطالعہ سے فقہ شافعی کا اثر اور بڑھتا گیا۔ آخر میں امام مالک کی کتاب مؤطا کی طرف بہت توجہ ہوئی اور اس کی عربی و فارسی میں دو شرحیں مختصر لکھیں اور اس کی فوج سے مذہب مالکی کا اثر بھی آپ پر چڑھا۔ لیکن آپ اکثر امام مالک کا مذہب مؤطا کی روایتوں ہی کو ٹھہراتے ہیں حالانکہ مالکیہ میں بہت سے مؤطا کے اقوال مہجور ہیں اور مذہب میں داخل نہیں۔

امام احمد کا مذہب حقیقت میں امام شافعی کے مذہب کے فرع ہے بلکہ ظاہریت و اجتہاد میں ایک برزخ ہے مشکل سے امام احمد کا کوئی ایسا قول ملے گا جو مذہب شافعی میں کوئی روایت اس کے مطابق نہ ہو غرض اس طرح سے آپ کی طبیعت پر مذہب اربعہ کی فقہ اثر انداز ہوتی گئی اور اس کی خواہش ہوئی کہ ایک ایسا جامع مسلک اختیار کیا جائے جس کے ذریعہ مذہب میں تطبیق و توفیق ہو جائے سارے احکام کے ذخیرہ میں بیس مسئلے ایسے نہیں ملیں گے جس میں امام ابوحنیفہ منفرد ہوں، یا ابوحنیفہ کا کوئی قول

۱۔ سے جو اس کے حقیقی خدوخال چھپ گئے ہیں اس کو واضح کر سکیں۔
۲۔ حنفیہ اور شافعیہ جس پر متفق ہوں اس پر آپ ضرور عمل کرتے ہیں اگر ان میں اختلاف ہو تو اس جانب کو اختیار کرتے ہیں جس کی تائید حدیث سے ہوتی ہو۔

۳۔ آپ مجتہدین امت کی اتباع ضرور کرتے ہیں۔ متاخرین کی تحریجات جو وہ قدام کے کلام سے کرتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ اسے بھی آپ قبول کریں۔

ان نتائج میں غور کرنے سے یہی معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب ایک فقیہ انفس حنفی محدث ہیں اور ان فقہاء محدثین کے زمرے میں ہیں جو قوی و ضعیف، صحیح و غلط اور رائج و مرجوح میں پوری بصیرت کے ساتھ فیصلہ کر سکتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس درجہ کا کوئی حنفی محدث اور فقیہ انفس محقق دوسرا پیدا نہیں ہوا۔

حتی الوسع آپ حنفی مذہب ہی میں اس قول کو اختیار کرتے ہیں جو حدیث اور دوسرے مذاہب سے متفق ہو۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ فقہا حنفیہ میں شیخ ابن الہمام صاحب فتح القدر اور آپ کے دو محقق شاگرد حافظ حدیث قاسم بن قطلوبغا اور محقق ابن امیر الحاج جو تفسیر انفس کے ساتھ تبحر حدیث، اطلاع رجال فن جرح و تعدیل اور اصول فقہ وغیرہ میں پوری دستگاہ رکھتے ہیں اور بہت سے فروعی مسائل میں اپنی اپنی خاص رائے رکھتے ہیں، اسی طبقہ میں حضرت شاہ صاحب کا بھی شمار ہونا چاہئے بعض مسائل میں ان حضرات کا حنفیہ سے خلاف کرنا جیسے مذہب حنفی کے خلاف نہیں سمجھا جاتا اور اس کے باوجود ان کو فقہا حنفیہ ہی میں شمار کیا جاتا ہے اسی طرح بعض مسائل و احکام میں مذہب حنفی کے خلاف شاہ صاحب کا رجحان انفس حنفی مذہب کے خلاف نہیں کہا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کا عام مذہب حنفی تھا اور فتوحات اسلامیہ سے لے کر سلطان محمد شاہ کے آخری وقت تک ہی قانونی مذہب رہا سلطان عالمگیر اورنگ زیب رحمہ اللہ نے فتاویٰ عالمگیر یہ تدوین کرایا ان تدوین میں جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم بھی شامل تھے۔ اور آخری اسلامی دور کا یہی ہندوستان میں قانون رہا۔ ہندوستان کے حنفی محدثین

استفتاء میں مستفتی کا خیال کرتے ہیں اور اس کو اسی کے مذہب کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں اگر آپ مجتہد ہوتے تو اپنی رائے کے مطابق جس کو صحیح خیال فرماتے وہی جواب دیتے بہر حال مدارک اجتہاد کا سمجھنا بھی ہم جیسوں کا کام نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کے لئے یہ فخر کافی ہے کہ مختلف فضائل و کمالات کے ساتھ مدارک اجتہاد اور ائمہ کے منشاء اختلاف کو وہ سمجھتے ہیں اور ترجیح و تمیز پر بصیرت کے ساتھ قادر ہیں خلاصہ یہ ہے کہ آپ مفتی فقیہ اور فقیہ محلث کے درجہ میں ایک جلیل القدر دقیق النظر فقیہ، واسع الاطلاع محدث ہیں، اس موضوع کے اطراف و جوانب ابھی بہت کچھ تشنہ تحقیق ہیں، نیز حضرت شاہ صاحب کے مسلک کے متعلق آپ کی تصنیفات میں بہت کچھ ذخیرہ اس کے علاوہ بھی موجود ہے لیکن اس وقت اس فرصت میں اسی مختصر مضمون پر کفایت کرتا ہوں توقع ہے کہ اہل علم و طلبہ کے لئے بصیرت سے خانہ ہوگا۔

واللہ ولی التوفیق والہدایہ

حواشی

- ۱- مختصر جامع بیان العلم ۱۸۲
- ۲- مختصر جامع بیان العلم ۱۸۲
- ۳- تہذیب اجتہاد لابن حجر صفحہ ۲۲۳ جلد ۲
- ۴- مقدمہ نصب الراية صفحہ ۳۵ مطبوعہ مجلس علمی ذابھیل ضلع سورت
- ۵- "الفرقان" چونکہ مضمون خالص علمی ہے اور صرف اہل علم ہی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں اور وہی اس کے مخاطب بھی ہیں اس لئے شاہ صاحب کی عبارات کے تراجم درج کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ورنہ جتنا حصہ اس کا عام فہم ہو سکتا ہے وہ مولانا خیر محمد صاحب کے اس مضمون میں آ گیا ہے جو اس مضمون کے بعد موصولاً درج ہے۔
- ۶- فیوض الحرمین کے ایک قلمی نسخہ میں جو مکہ معظمہ میں عبدالستار صاحب کے کتب خانہ میں ہے یہاں پر اتنی زیادت موجود ہے کہ حافظ ابی جعفر الطحاوی

☆☆☆☆☆

یا ابو یوسف و محمد کا کوئی قول امام شافعی کے موافق موجود نہ ہو اس لئے آپ نے جامعیت مذاہب کا یہ مسلک اختیار کیا لیکن اس طرح پر کہ اس جامعیت کو اختیار کر کے بھی آپ حنفی رہ سکیں کیونکہ "وایاک ان تخالف القوم فی الفروع" (خبر دار اپنی قوم یعنی اہل ملک کی فروعی مسائل میں مخالفت نہ کرنا، آپ کو سرکار مدینہ کا حکم مل چکا تھا جیسا کہ فیوض الحرمین کے مذکورہ بالا اقتباسات میں گزر چکا۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شاہ صاحب کا ایک مکتوب "کلمات طیبات" کے صفحہ ۶۱ پر دیکھا جو کچھ میں لکھ چکا ہوں اس مکتوب سے اور اس کی تائید نکلتی ہے ممکن ہے کہ کسی کو کچھ غلط فہمی ہو جائے اس لئے نقل کر کے چند جملے عرض کروں گا۔

سوال آنکے عمل تو در مسائل فقہیہ بر کلام مذہب است؟

"گفتم بقدر امکان جمع می کنم در مذاہب مشہورہ مثلاً صوم و صلاۃ و وضوء و غسل و حج بوضع واقع می شود کہ ہمہ اہل مذاہب صحیح دانند و عند تعذرا کجمع باقوی مذاہب از روئے دلیل و موافقت صریح حدیث عمل می نمایم و خدائے تعالیٰ اس قدر علم دادہ است کہ فرق میان ضعیف و قوی کردہ شود و در فتویٰ بحال مستفتی کاری کنم مقلد ہر مذہبی کہ باشد اور از ہماں مذہب جواب می گویم خدائے تعالیٰ بہر مذہب از مذاہب مشہورہ معرفتے داد ہاست الحمد للہ تعالیٰ" اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ مجتہد مطلق نہ تھے بلکہ ان محدثین و فقہائے امت میں سے تھے جو مذاہب کے احکام و ادلہ سامنے رکھ کر قوی و ضعیف کا فیصلہ بخوبی کر سکتے ہیں ورنہ جو شخص درجہ اجتہاد مطلق کو پہنچ جائے اس پر تقلید دوسرے کی حرام ہو جاتی ہے وہاں تو اس کی گنجائش نہیں نکلتی کہ بناء بر احتیاط مذاہب میں تطبیق و توفیق دتے رہیں۔ پس یہ جامعیت کا مسلک ہی خود ہمیں بتلا رہا ہے کہ آپ مجتہد نہ تھے ورنہ جواب میں صاف فرمادیتے کہ میں اپنی عصر کا خود مجتہد ہوں کسی خاص مذہب کا پابند نہیں بلکہ غور سے کچھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بجائے کسی ایک مذہب کے اتباع کے مذاہب اربعہ اور بالخصوص حنفیہ و شافعیہ سب کا اتباع ایک حد تک ضروری سمجھتے ہیں۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ عوام امت کے لئے اپنے اپنے مذاہب کی تقلید ہی ضروری جانتے ہیں اس لئے

شاہ ولی اللہ دہلویؒ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لیڈر اپنے خیالات کے مطابق خود کوئی عملی تحریک اٹھاتے ہوں اور بگڑی ہوئی دنیا کو تورا پھوڑ کر اپنے ہاتھوں سے نئی دنیا بنانے کے لئے میدان میں نکل آتے ہوں۔ تاریخ میں اس کی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں اس طرز کے لیڈروں کا اصلی کارنامہ یہی ہوتا ہے کہ وہ تنقید سے صد ہا برس کی جچی ہوئی غلط فہمیوں کا غبار چھانٹ دیتے ہیں، اذہان میں نئی روشنی پیدا کرتے ہیں زندگی کے بگڑے ہوئے مگر پختہ بنے ہوئے سانچے کو عالم ذہنی میں توڑتے ہیں اور اس کے بلبے میں سے اصلی اور پائیدار حقیقتوں کو نکال کر دنیا کے سامنے رکھ جاتے ہیں، یہ کام بجائے خود اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی مشغولیوں سے آدمی کو اتنی فرصت مشکل ہی سے مل سکتی ہے کہ خود میدان میں آکر تعمیر کا عملی کام بھی کر سکے اگرچہ شاہ صاحب فہمات الہیہ میں ایک جگہ اشارہ کرتے ہیں کہ اگر موقع محل کا اقتضا ہوتا تو میں جنگ کر کے عملاً اصلاح کرنے کی قابلیت بھی رکھتا تھا (۲)۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ انھوں نے اس طرز کا کوئی کام نہیں کیا۔ بلکہ اپنے خیالات کی دنیا میں ان کا انہماک اتنا بڑھا ہوا تھا کہ خود ان کے اپنے گھر اور ان کے قریبی حلقہ میں بہت سے غیر اسلامی طریقے رائج تھے اور وہ ان کی اصلاح پر بھی توجہ صرف کرنے سے معذور رہے، مثلاً السلام علیکم تک کا رواج ان کے گھر میں نہ تھا۔ ”رفیع الدین آداب بجالاتا ہے۔“ عبدالقادر تسلیمات عرض کرتا ہے، سلام مسنون کے بجائے اس قسم کے فقرے بولے جاتے تھے۔ شاہ صاحب کی پوتی اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی صاحبزادی جوان بیوہ بیٹھی ہوئی تھی اور نکاح ثانی میں انھیں اس لئے

حضرت مجدد الف ثانی کی وفات کے ۸۰ سال بعد اور عالمگیر بادشاہ کی وفات سے چار سال پہلے نواحِ دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب پیدا ہوئے (۱)۔ ایک طرف ان کے زمانے اور ماحول کو اور دوسری طرف ان کے کام کو جب آدمی بالمقابل رکھ کر دیکھتا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس دور میں اس نظر، ان خیالات، اس ذہنیت کا آدمی کیسے پیدا ہو گیا۔ فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا۔ اس تاریک زمانہ میں نشوونما پا کر ایسا آزاد خیال مفکر و مبصر منظر عام پر آتا ہے جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے، تقلیدی علم اور صدیوں کے ججے ہوئے تعصبات کے بند توڑ کر مسئلہ زندگی پر محققانہ و مہتمدانہ نگاہ ڈالتا ہے اور ایسا لٹریچر چھوڑ کر جاتا ہے جس کی زبان، انداز بیان، خیالات، نظریات، مواد تحقیق اور نتائج مستخرجہ، کسی چیز پر بھی ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا، حتیٰ کہ اس کے اوراق کی سیر کرتے ہوئے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں اس جگہ لکھی گئی تھیں جس کے گرد و پیش عیاشی، فسق پرستی، قتل و غارت، جبر و ظلم اور بد امنی و طوائف المملو کی کا طوفان برپا تھا۔

شاہ صاحب تاریخ انسانی کے ان لیڈروں میں سے ہیں جو خیالات کے الجھے ہوئے جنگل کو صاف کر کے فکر و نظر کی ایک صاف، سیدھی شاہراہ بناتے ہیں اور ذہن کی دنیا میں حالات موجودہ کے خلاف ایسی بے چینی اور تعمیر نو کا ایسا دل آویز نقشہ پیدا کر کے چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہاگزیر طور پر تجربہ فاسد و تعمیر صالح کے لئے ایک تحریک اٹھتی ہے۔ شاذ

قریب ان تمام جاہلی آمیزشوں کی نشان دہی ہو گئی ہے جو مسلمانوں کے عقائد، افکار، علوم، اخلاق، تمدن اور سیاست میں ہوتی رہیں۔

پھر شاہ صاحب نے خرابیوں کے اس ہجوم میں کھوج لگا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں بنیادی خرابیاں کونسی ہیں جن میں باقی تمام خرابیوں کا شجرہ نسب ملتا ہو، اور آخر کار دو چیزوں پر انگلی رکھ دی ہے۔ ایک اقتدار سیاسی کا خلافت سے پادشاہی کی طرف انتقال، دوسرے روح اجہتاہ کا مردہ ہو جانا اور تقلید جاہد کا دامغوں پر مسلط ہو جانا۔

پہلی خرابی پر انھوں نے ازالہ میں پوری تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے خلافت اور بادشاہی کے اصولی و اصطلاحی فرق کو جس قدر واضح صورت میں انھوں نے بیان کیا ہے اور جس طرح احادیث سے اس کی تشریح کی ہے، ان کی کوئی مثال ان سے پہلے کے مصنفین کی تحریروں میں نہیں ملتی۔ اسی طرح اس انقلاب کے نتائج کو بھی جس صراحت کے ساتھ انھوں نے

پیش کیا ہے وہ انگوں کے کلام میں مفقود ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”ارکان اسلام کی اقامت میں فتور عظیم برپا ہو گیا.....“

حضرت عثمان کے بعد کسی فرمانروا نے حج قائم نہیں کیا بلکہ

ہمیشہ اپنے نائب ہی مقرر کر کے بھیجتے رہے، حالانکہ اقامت حج

خلافت کے لوازم میں سے ہے جس طرح تخت پر بیٹھنا،

تاج پہننا اور شاہان گزشتہ کی شہنشین میں بیٹھنا قیصر و کسری

کے لئے علامت پادشاہی تھا اسی طرح حج خود اپنی امارت

میں قائم کرنا اسلام میں علامت خلافت ہے“

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

”پہلے وعظ اور فتویٰ دونوں خلیفہ کی رائے پر موقوف تھے۔

خلیفہ کی اجازت کے بغیر نہ وعظ کہا جاسکتا تھا اور نہ کوئی شخص

فتویٰ دینے کا مجاز تھا۔ مگر اس انقلاب کے بعد وعظ اور

فتوے دونوں اس نگرانی سے آزاد ہو گئے بلکہ بعد میں تو فتویٰ

دینے کیلئے جماعت صالحین کے مشورے کی قید بھی نہ رہی“

پھر فرماتے ہیں:-

”ان لوگوں کی حکومت مجوسیوں کی حکومت کے مانند رہی

تال تھا کہ ہندو نہ جاہلیت سے معیوب سمجھتی تھی۔ بی بی کی صحت اور اسی قسم کی نیازوں کا سلسلہ خود اس خاندان کی خواتین میں جاری تھا (۳)۔

یہ سب باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شاہ صاحب کی ساری قوتوں کو تنقید و تعمیر افکار کے بھاری کام نے بالکل اپنے اندر جذب کر رکھا تھا اور ان کو

اس کار عظیم سے اتنی مہلت بھی نہ ملتی تھی کہ اپنے قریب ترین ماحول کی طرف ہی توجہ کر سکتے جیسا کہ آگے چل کر عرض کیا جائے گا کہ، ان کے

صاف کئے ہوئے راستے پر عملی جدوجہد کرنے کے لئے کچھ دوسرے لوگوں کی ضرورت تھی اور وہ نصف صدی کے اندر خود انہی کے حلقہٴ تعلیم و تربیت

سے نشوونما پا کر اٹھے۔

شاہ صاحب کے تجدیدی کارنامے کو ہم دو بڑے عنوانات پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک عنوان تنقید و تنقیح کا، اور دوسرا عنوان تعمیر کا، میں ان

دونوں کو الگ الگ بیان کروں گا۔

پہلے عنوان کے سلسلے میں شاہ صاحب نے پوری تاریخ اسلام پر

تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے شاہ صاحب پہلے شخص ہیں

جس کی نظر تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین کے اصولی فرق اور باریک فرق

تک پہنچی اور جس نے تاریخ مسلمین پر تاریخ اسلام کے نقطہ نظر سے نقد

وتبرہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان بہت سی صدیوں میں اسلام

قبول کرنے والی اقوام کے درمیان فی الواقع اسلام کا کیا حال رہا ہے۔ یہ

ایک ایسا نازک مضمون ہے جس کی پیچیدگیوں میں پہلے بھی لوگ الجھے

رہے ہیں اور اب تک الجھے ہوئے ہیں، چنانچہ شاہ صاحب کے بعد بھی

کوئی ایسا صاحب نظر نہ اٹھا جس کے ذہن میں حقیقی تاریخ اسلام کا، تاریخ مسلمین سے الگ، کوئی واضح تصور ہوتا، شاہ صاحب کے کلام میں مختلف

مرض کی پوری تاریخ بیان کی ہے اور ان خرابیوں کی نشاندہی کی ہے جو اس کی بدولت پیدا ہوئیں۔

تاریخی تنقید کے بعد شاہ صاحب اپنے زمانہ کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں اور ایک ایک گروہ کا نام بنام پکار کر اس کے نقایص بیان کرتے ہیں۔ تقسیمات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”یہ وصی (یعنی خود شاہ صاحب) ایسے زمانہ میں پیدا ہوا ہے جبکہ لوگوں میں تین چیزیں خلط ملط ہو گئیں ہیں۔“

(۱) دلیل بازی، اور یہ یونانی علوم کے اختلاط کی بدولت ہے۔ لوگ کلامی مباحث میں مشغول ہو گئے ہیں یہاں تک کہ عقائد میں کوئی گفتگو ایسی نہیں ہوئی جو استدلالی مناظرات سے خالی ہو۔

(۲) وجدان پرستی، اور یہ صوفیوں کی مقبولیت اور ان کی حلقہ بگوشی کی وجہ سے ہے جس نے مشرق سے مغرب تک لوگوں کو گھیر رکھا ہے، یہاں تک کہ ان حضرات کے اقوال و احوال لوگوں کے دلوں پر کتاب و سنت اور ہر چیز سے زیادہ تسلط رکھتے ہیں، ان کے رموز و اشارات اس قدر دخل پا گئے ہیں کہ جو شخص ان رموز و اشارات کا انکار کرے یا ان سے خالی ہو وہ مقبول ہوتا ہے، نہ صالحین میں شمار ہوتا ہے، منبروں پر کوئی واعظ ایسا نہیں جس کی تقریر اشارات صوفیہ سے پاک ہو، اور درس کی مسندوں پر کوئی عالم ایسا نہیں جو ان کے کلام میں اعتقاد اور غور و خوض کا اظہار نہ کرے، ورنہ اس کا شمار گدھوں میں ہونے لگتا ہے۔ پھر امراء و روساء وغیرہ کی کوئی مجلس ایسی نہیں جن کے ہاں لطف کلام اور بذلہ سخی اور تفنن طبع کے لئے صوفیہ کے اشعار اور نکات کھلونا بنے ہوئے نہ ہوں۔

(۳) طاعت، اور یہ اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ ملت اسلامیہ میں داخل ہیں پھر اس زمانہ کی ایک بیماری یہ ہے کہ ہر ایک اپنی رائے پر چلتا ہے اور بگ ٹٹ چلا جا رہا ہے، نہ تشابہت پر جا کر رکتا ہے اور نہ کسی ایسے امر میں دخل دینے سے باز رہتا

ہے بس فرق یہ ہے کہ یہ نماز پڑھتے اور کلمہ شہادت زبان سے ادا کرتے رہے ہیں، ہم اسی تغیر کے دامن میں پیدا ہوئے ہیں، معلوم نہیں آگے چل کر خدائے تعالیٰ کیا دکھانا چاہتا ہے۔“

رہی دوسری خرابی تو شاہ صاحب نے ازالہ میں، حجت میں، بدور بازنہ میں، تقسیمات میں، مسویٰ اور مصفیٰ میں، اور قریب قریب اپنی ہر تصنیف میں اس پر ماتم کیا ہے۔ ازالہ میں فرماتے ہیں:-

”دولت شام (اموی سلطنت) کے خاتمہ تک کوئی اپنے آپ کو خفی یا شافعی نہ کہتا تھا بلکہ سب اپنے اپنے ائمہ اور اساتذہ کے طریقے پر دلائل شرعی سے استنباط کرتے تھے۔ دولت عراق (عباسی سلطنت) کے زمانہ میں ہر ایک نے اپنا ایک نام متعین کیا اور یہ کیفیت ہو گئی کہ جب تک اپنے مذہب کے بڑوں کی نص نہ پاتے کتاب و سنت کی دلیل پر حکم نہ کرتے۔ اس طرح وہ اختلافات جو تاویل کتاب و سنت کے مقتضا سے ناگزیر طور پر پیدا ہوتے تھے، مضبوط بنیادوں پر جم گئے، پھر جب دولت عرب کا خاتمہ ہو گیا (یعنی ترکی اقتدار کا زمانہ آیا) اور لوگ مختلف ممالک میں منتشر ہوئے تو ہر ایک نے جو کچھ اپنے مذہب فقہی سے یاد کیا تھا اسی کو اصل بنا لیا۔ پہلے جو چیز مذہب مستنبط تھی اب وہ سنت مستقرہ بن گئی۔ اب ان کے علم کا مدار اس پر رہ گیا کہ تزج پر تزج کریں اور تفریح پر تفریح۔“

مصنف میں لکھتے ہیں:-

”ہمارے زمانہ کے سادہ لوح اجتہاد سے بالکل برگشتہ ہیں۔ اونٹ کی طرح ناک میں کیل پڑی ہے اور کچھ نہیں جانتے کہ کدھر جا رہے ہیں۔ ان کا کاروبار ہی دوسرا ہے، یہ بچارے ان امور کی سمجھ بوجھ کیلئے مکلف ہی نہیں ہیں۔“

حجت کے مبحث ہفتم میں اور انصاف میں شاہ صاحب نے اس

نبی کی کوئی حدیث پہنچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میرا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے نہ کہ حدیث پر۔ پھر وہ حیلہ یہ پیش کرتا ہے کہ ”صاحب! حدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ تو کالمین و ماہرین کا کام ہے، اور یہ حدیث ائمہ سلف سے چھپی تو رہی نہ ہوگی، پھر کوئی وجہ تو ہوگی کہ انہوں نے اسے ترک کر دیا“ جان رکھو کہ یہ ہرگز دین کا طریقہ نہیں ہے اگر تم اپنے نبی پر ایمان لائے ہو تو اس کا اتباع کرو خواہ کسی مذہب کے موافق ہو یا مخالف.....

میں ان مشفق و اعظموں، عابدوں اور خانقاہ نشینوں سے کہتا ہوں کہ اے زہد کے مدعیو! تم ہر وادی میں بھٹک نکلے اور ہر رطب و یابس کو لے بیٹھے۔ تم نے لوگوں کو موضوعات اور باطل کی طرف بلایا، تم نے خلق خدا پر زندگی کی دائرہ تنگ کر دیا، حالانکہ تم فراخی کے لئے مامور تھے نہ کہ تنگی کے لئے۔ تم نے مغلوب الحال عشاق کی باتوں کو اپنا مدار علیہ بنا لیا ہے حالانکہ یہ چیزیں پھیلانے کی نہیں، لپیٹ کر رکھ دینے کی ہیں..... میں امراء سے کہتا ہوں کہ تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا؟ تم فانی لذتوں کی طلب میں مستغرق ہو گئے اور رعیت کو چھوڑ دیا کہ ایک دوسرے کو کھا جائے۔ علانیہ شرابیں پی جا رہی ہیں اور تم نہیں روکتے، زنا کاری، شراب خواری اور قمار بازی کے اڈے برسرام بن گئے ہیں اور تم انکا انسداد نہیں کرتے۔ اس عظیم الشان ملک میں مدتہائے دراز سے کوئی حد شرعی نہیں لگائی گئی جس کو تم ضعیف پاتے ہو، اسے کھا جاتے ہو اور جسے قوی پاتے ہو اسے چھوڑ دیتے ہو، کھانوں کی لذت، عورتوں کے ناز و انداز، کپڑوں اور مکانوں کی لطافت، بس یہ چیزیں ہیں جن میں تم ڈوب گئے ہو، کبھی خدا کا خیال تمہیں نہیں آتا.....

میں ان فوجی آدمیوں سے کہتا ہوں کہ تم کو تو اللہ نے جہاد کے لئے، اعلائے کلمہ حق کے لئے، شرک و اہل شرک کا زور

ہے جو اس کے علم سے بالاتر ہو۔ احکام کے معانی اور اسرار پر ہر ایک اپنی عقل سے کلام کر رہا ہے اور جو کچھ جس نے سمجھ لیا ہے اس پر دوسروں سے مناظر و مباحثہ کر رہا ہے۔ دوسری بیماری یہ ہے کہ فقہ میں حنفی، شافعی وغیرہ کے سخت اختلافات پائے جاتے ہیں، ہر ایک اپنے طریقہ میں تعصب برتا ہے اور دوسروں کے طریقہ پر اعتراض کرتا ہے۔ ہر مذہب میں تخریجات کی کثرت ہے اور حق اس غبار میں چھپ گیا ہے۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

”میں ان بیزاروں سے، جو کسی استحقاق کے بغیر باپ دادا کی گدیوں پر بیٹھے ہیں، کہتا ہوں کہ یہ کیا دھڑے بندیاں تم نے کر رکھی ہیں؟ کیوں تم میں سے ہر ایک اپنے طریقہ پر چل رہا ہے اور کیوں اس طریقہ کو سب نے چھوڑ رکھا ہے جسے اللہ نے محمد ﷺ پر اتارا تھا؟ تم میں سے ہر ایک امام بن بیٹھا ہے، اپنی طرف لوگوں کو بلارہا ہے اور اپنے آپ کو ہادی و مہدی سمجھتا ہے حالانکہ وہ ضال و مضل ہے۔ ہم ہرگز ان لوگوں سے راضی نہیں ہیں جو دنیا کے فوائد کی خاطر لوگوں سے بیعت لیتے ہیں، یا اسلئے علم حاصل کرتے ہیں کہ اغراض دنیوی حاصل کریں، یا لوگوں کی اپنی طرف دعوت دیتے ہیں اور اپنی خواہشات نفس کی اطاعت ان سے کراتے ہیں، یہ سب رہن ہیں، دجال ہیں، کذاب ہیں، خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکہ دے رہے ہیں.....

میں ان طالبان علم سے کہتا ہوں کہ جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ بے وقوفو! تم یونانیوں کے علوم اور صرف و نحو و معانی میں پھنس گئے اور سمجھے کہ علم اس کا نام ہے، حالانکہ علم تو کتاب اللہ کی آیت محکمہ ہے، یادہ سنت ہے جو رسول سے ثابت ہو..... تم پچھلے فقہاء کے احسانات اور تفریعات میں ڈوب گئے کیا تمہیں خبر نہیں کہ حکم صرف وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا ہو؟ تم میں سے اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو

رضی اللہ عنہ اس روز شہید کیے گئے تو کونسا دن ہے جس میں کسی محبوب خدا کی موت واقع نہ ہوئی ہو؟ کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنا لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے۔ پھر تم شب برات میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور تم میں ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہئے۔ اگر تم سچے ہو تو اپنے اس خیال اور ان حرکات کے لئے کوئی دلیل لاؤ۔ پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمہاری زندگی تنگ ہو رہی ہے، مثلاً شادیوں میں فضول خرچی، طلاق کو ممنوع بنا لینا، بیوہ عورت کو بٹھا رکھنا۔ اس قسم کی رسموں میں تم اپنے مال اور دینی زندگیوں کو خراب کر رہے ہو اور ہدایت صالحہ کو تم نے چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ بہتر یہ تھا کہ ان رسموں کو چھوڑ کر اس طریقہ پر چلتے جس میں سہولت تھی نہ کہ تنگی۔ پھر تم نے موت اور غمی کو عید بنا رکھا ہے، گویا تم پر کسی نے فرض کر دیا ہے کہ جب کوئی مرے تو اس کے اقربا خوب کھانے کھلائیں، تم نمازوں سے غافل ہو، کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ نماز کے لئے وقت نہیں پاتا اور کوئی اپنی تفریحوں اور خوش گپیوں میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ نماز فراموش ہو جاتی ہے، تم زکوٰۃ سے بھی غافل ہو، تم میں کوئی مالدار ایسا نہیں جس کے ساتھ بہت سے کھانے والے لگے ہوئے نہ ہوں، وہ ان کو کھلاتا اور پہناتا ہے مگر زکوٰۃ اور عبادت کی نیت نہیں کرتا۔ تم رمضان کے روزے بھی ضائع کرتے ہو اور اس کے لئے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو، تم لوگ سخت بے تدبیر ہو گئے ہو تم نے اپنی بسراوقات کا انحصار سلاطین کے وظائف و مناصب پر کر رکھا ہے اور جب تمہارا بار سنبھالنے کے لئے سلاطین کے خزانے کافی نہیں ہوتے تو وہ رعیت کو تنگ کرنے لگتے ہیں.....“

توڑنے کے لئے بنایا تھا۔ اس کو چھوڑ کر تم نے گھوڑ سواری اور ہتھیار بندی کو پیشہ بنا لیا اب جہاد کی نیت اور قصد سے تمہارے دل خالی ہیں پیسہ کمانے کے لئے سپاہ گری کا پیشہ کرتے ہو، بھنگ اور شراب پیتے ہو، داڑھیاں منڈاتے ہو اور مونچھیں بڑھاتے ہو۔ بندگان خدا پر ظلم ڈھاتے ہو اور تمہیں کبھی اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ حرام کی روٹی کما رہے ہو یا حلال کی، خدا کی قسم تمہیں ایک روز دنیا سے جانا ہے، پھر اللہ تمہیں بتائے گا کہ کیا کر کے آئے ہو.....

میں ان اہل حرفہ اور عوام سے کہتا ہوں کہ تم میں سے امانت و دیانت رخصت ہو گئی ہے اپنے رب کی عبادت سے تم غافل ہو گئے ہو اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگے ہو، تم غیر اللہ کے لئے قربانیاں کرتے ہو اور مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو، یہ تمہارے بدترین افعال ہیں۔ تم میں سے جو کوئی خوشحال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے لباس اور کھانے پر اتنا خرچ کرتا ہے کہ اس کی آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہوتی اور اہل و عیال کی حق تلفی کرنی پڑتی ہے، یا پھر وہ شراب نوشی اور کرایہ کی عورتوں میں اپنی معاش اور معاد دونوں کو ضائع کرتا ہے..... پھر میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو عام خطاب کر کے کہتا ہوں کہ اے بنی آدم! تم نے اپنے اخلاق کھودیئے، تم پر تنگ دلی چھا گئی اور شیطان تمہارا محافظ بن گیا۔ عورتیں مردوں پر حاوی ہو گئی ہیں اور مردوں نے عورتوں کو ذلیل بنا رکھا ہے۔ حرام میں تمہیں مزا آتا ہے اور حلال تمہارے لئے بد مزہ بن گیا ہے..... اے بنی آدم! تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے۔ مثلاً روز عاشوراء کو تم جمع ہو کر باطل حرکات کرتے ہو۔ ایک جماعت نے اس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ سب دن اللہ کے ہیں اور سارے حوادث اللہ کی مشیت سے ہوتے ہیں؟ اگر حسین

ایک اور تفہیم میں فرماتے ہیں:-

”جو لوگ حاجتیں طلب کرنے کے لئے اجیر یا سالار مسعود کی قبر یا ایسے ہی دوسرے مقامات پر جاتے ہیں وہ اتنا بڑا گناہ کرتے ہیں کہ قتل اور زنا کا گناہ اس سے کم تر ہے۔ آخر اس میں اور خود ساختہ معبودوں کی پرستش میں فرق کیا ہے؟ جو لوگ لات اور عزیٰ سے حاجتیں طلب کرتے تھے ان کا فعل ان لوگوں کے فعل سے آخر کس طرح مختلف تھا؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم ان کے برعکس ان لوگوں کو صاف الفاظ میں کافر کہنے سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ خاص ان کے معاملہ میں شارع کی نص موجود نہیں ہے۔ مگر اصولاً ہر وہ شخص جو کسی مردے کو زندہ ٹھہرا کر اس سے حاجتیں طلب کرتا ہے اس کا دل گناہ میں مبتلا ہے۔“

یہ اقتباسات بہت طویل ہو گئے ہیں، مگر قسیمات جلد دوم کے چند فقرے اور تقاضا کر رہے ہیں کہ ان کو بھی اس سلسلہ میں ناظرین تک پہنچا دیا جائے۔ فرماتے ہیں:-

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ تم مسلمان بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی امتوں کے طریقے اختیار کر لو گے اور جہاں جہاں انھوں نے قدم رکھا ہے وہاں تم بھی قدم رکھو گے حتیٰ کہ وہ کسی گویہ کے بل میں گھے ہیں تو تم بھی ان کے پیچھے جاؤ گے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ پہلی امتوں سے آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ حضور نے فرمایا اور کون؟ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔“

سچ فرمایا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں جنہوں نے صلحا کو رباب من دون اللہ بنا لیا ہے اور یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے۔ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں۔ جو کلام شارع میں تحریف کرتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرتے

ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لئے ہیں اور گناہگار میرے لیے، یہ اسی قسم کی بات ہے جیسی یہودی کہتے تھے کہ لن تمسنا النار الا ایما معدودة (ہم دوزخ میں نہ جائیں گے اور گئے بھی تو بس چند روز کے لئے) سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے۔ صوفیہ کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں جو کتاب و سنت سے مطابقت نہیں رکھتے، خصوصاً مسئلہ توحید میں۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شرع کی انھیں بالکل پروا نہیں ہے۔ فقہاء کی فقہ کو دکھو تو اس میں اکثر وہ باتیں ملتی ہیں جن کے ماخذ کا پتہ ہی نہیں، مثلاً وہ درود کا مسئلہ (۶) اور کنوؤں کی طہارت کا مسئلہ (۷)۔ رہے اصحاب معقول اور شعراء اور اصحاب ثروت اور عوام تو ان کی تحریفات کا ذکر کہاں تک کیا جائے“

ان اقتباسات سے ایک دھندلا سا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب نے مسلمانوں کے ماضی اور حال کا کس قدر تفصیلی جائزہ لیا ہے اور کس قدر جامعیت کے ساتھ ان پر تنقید کی ہے۔ اس قسم کی تنقید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جتنے صالح عناصر موجود ہوتے ہیں، جن کے ضمیر و ایمان میں زندگی اور جن کے قلب میں برے اور بھلے کی تیز ہوتی ہے، ان کو حالات کی خرابی کا احساس سخت مضطرب کر دیتا ہے۔ ان کی اسلامی حس اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اپنے گرد و پیش کی زندگی میں جاہلیت کا ہر اثر انھیں کھٹکنے لگتا ہے۔ ان کی قوت امتیاز اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں اسلام اور جاہلیت کی آمیزشوں کو تحلیل کرنے لگتے ہیں اور ان کی قوت ایمانی اس قدر بیدار ہو جاتی ہے کہ خارزار جاہلیت کی ہر کھٹک انھیں اصلاح کے لئے بے چین کر دیتی ہے۔ اس کے بعد مجدد کیلئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کے سامنے تعمیر نو کا ایک نقشہ واضح صورت میں پیش کرے تاکہ حالت موجودہ کو جس حالت سے بدلنا مطلوب ہے اس پر وہ اپنی نظر جماسکیں اور اپنی تمام سعی و عمل کو اسی سمت میں مرکوز کر دیں۔ یہ تعمیری کام بھی شاہ صاحب نے اسی خوبی اور جامعیت کے ساتھ انجام دیا جو ان کے تنقیدی کام میں آپ دیکھ چکے ہیں۔

کوئی اصل نہ ملے اسے ساقط کر دیا جائے، پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں، اگر وہ دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہوں تو وہ اس لائق ہیں کہ انھیں دانتوں سے پکڑ لیا جائے اور اگر ان میں دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو مسئلہ میں دونوں قول تسلیم کئے جائیں اور دونوں پر عمل کرنے کو صحیح قرار دیا جائے۔ یا تو ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسی قرآن میں اختلاف قرات کی حیثیت ہے۔ یا رخصت اور عزیمت کا فرق ہوگا، یا کسی نخصہ سے نکلنے کے دو راستوں کی نوعیت ہوگی جیسے تعدد کفارات یا دو برابر کے مباح طریقوں کا ساحل ہوگا۔ ان چار پہلوؤں کے باہر کوئی پہلو انشاء اللہ تعالیٰ نہ پایا جائے گا۔“

انصاف میں انھوں نے اپنی رائے اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ دی ہے چنانچہ باب سوم میں واعلم ان التخریج علی کلام الفقہاء سے لے کر آخر باب تک جو کچھ لکھا ہے وہ اس لائق ہے کہ اہل الحدیث اور اہل تخریج دونوں اس کو غور کی نگاہ سے دیکھیں۔ اس بحث میں انھوں نے طریقہ کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ طریق اہل حدیث اور طریق اہل تخریج، دونوں کو صحیح کیا جائے۔ اسی طرح حجت کے بحث ہفتم میں فصل ومما یناسب لهذا المقام التنبیہ علی مسائل ضلت فی بوادیاہ الافہام کے تحت جو بحث کی ہے وہ بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ یہ مسلک معتدل اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ تعصب اور تنگ نظری اور تقلید جامد اور لاطائل بحثوں میں تضیح اوقات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وسعت نظر کے ساتھ تحقیق و اجتہاد کا راستہ کھلتا ہے، چنانچہ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، اور قریب قریب ان کی تمام کتابوں میں ایسی عبارتیں موجود ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح تحقیق و اجتہاد پر اکسایا گیا ہے مثال کے طور پر مصنفی کے مقدمہ سے چند فقرے انہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:-

اجتہاد اور ہر عصر فرض بالکفایہ است۔ ومراد از اجتہاد اینجا.....

معرفت احکام شرعیہ از ادلہ تفصیلیہ و تفریع و ترتیب مجتہدانہ

تغیر کے سلسلے میں ان کا پہلا اہم کام یہ ہے کہ وہ فقہ میں ایک نہایت معتدل مسلک پیش کرتے ہیں جس میں کسی نے مذہب کی جانبداری اور دوسرے مذاہب پر نکتہ چینی نہیں پائی جاتی۔ ایک محقق کی طرح انھوں نے تمام مذاہب فقہ کے اصول اور طریق استنباط کا مطالعہ کیا ہے اور بالکل آزادانہ رائے قائم کی ہے جس مذہب کی کسی مسئلہ میں تائید کی، اس بنا پر کہ دلیل اس کے حق میں پائی، نہ اس بنا پر کہ وہ اس مذہب کی وکالت کا عہد کر چکے ہیں۔ اور جس سے اختلاف کیا، اس بنا پر کیا کہ دلیل اس کے خلاف پائی نہ اس بنا پر کہ انھیں اس سے عناد ہے اسی وجہ سے کہیں وہ خفی نظر آتے ہیں، کہیں شافعی، کہیں مالکی اور کہیں حنبلی انھوں نے ان لوگوں سے بھی اختلاف کیا ہے جو ایک مذہب کی پیروی کا قلابہ اپنی گردن میں ڈال لیتے ہیں اور قسم کھا لیتے ہیں کہ تمام مسائل میں اسی کا اتباع کریں گے اور اسی طرح وہ ان سے بھی سخت اختلاف کرتے ہیں جنھوں نے ائمہ مذاہب میں سے کسی کی مخالفت کا عہد کر لیا ہے۔ ان دونوں کے بین بین وہ ایک ایسے معتدل راستہ پر چلتے ہیں جس میں ہر غیر متعصب طالب حق کو اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کا رسالہ انصاف اس مسلک کا آئینہ ہے۔ یہی رنگ مصنفے اور ان کی دوسری کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ تمہمات میں ایک جگہ فرماتے ہیں:-

”میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابوحنیفہ اور شافعی کے مذہب امت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ پیرو بھی ان میں دونوں کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انہیں مذاہب کی زیادہ ہیں۔ فقہائے محدثین، مفسرین متکلمین اور صوفیہ اور زیادہ تر مذہب شافعی کے پیرو ہیں۔ اور حکومتیں اور عوام زیادہ تر مذہب حنفی کے متبع ہیں۔ اس وقت جو امر حق ملاء اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے جو کچھ ان کے موافق ہو وہ باقی رکھا جائے اور جس کی

مفصل ہے اور دوسری زیادہ فلسفیانہ۔

ان کتابوں میں انھوں نے مابعد الطبعی مسائل سے ابتدا کی ہے اور تاریخ میں پہلی مرتبہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص فلسفہ اسلام کو مدون کرنے کی بنا ڈال رہا ہے۔ اس سے پہلے مسلمان فلسفہ میں جو کچھ لکھتے اور کہتے رہے اس کو محض نادانی سے لوگوں نے ”فلسفہ اسلام“ کے نام سے موسوم کر رکھا ہے، حالانکہ وہ فلسفہ اسلام نہیں، فلسفہ مسلمین ہے جس کا شجرہ نسب یونان و روم اور ایران و ہندوستان سے ملتا ہے۔ فی الواقع جو چیز اس نام سے موسوم کرنے کے لائق ہے اس کی داغ بیل سب سے پہلے ہی دہلوی شیخ نے ڈالی ہے۔ اگرچہ اصطلاحات وہی قدیم فلسفہ و کلام یا فلسفیانہ تصوف کی زبان سے لی ہیں اور غیر شعوری طور پر بہت سے تخیلات بھی وہیں سے آگئے ہیں، جیسا کہ اوّل اول ہر نئی راہ نکالنے والے کے لئے طبعاً ناگزیر ہے، مگر پھر بھی تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھولنے کی یہ ایک بڑی زبردست کوشش ہے، خصوصاً ایسے شدید انحطاط کے دور میں اتنی طاقتور عقلیت کے آدمی کا ظاہر ہونا بالکل حیرت انگیز ہے۔

اس فلسفہ میں شاہ صاحب کائنات کا اور کائنات میں انسان کا ایک ایسا تصور قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں جو اسلام کے نظام اخلاق و تمدن کے ساتھ ہم آہنگ و متحد المزاج ہو سکتا ہے، یا دوسرے الفاظ میں جس کو اگر شجرہ اسلام کی جز قرار دیا جائے تو جڑ میں اور اس درخت میں جو اس سے پھوٹا، عقلاً کوئی فطری مہانیت محسوس نہ کی جاسکتی ہو (۷)۔ میں حیران رہ جاتا ہوں جب سنتا ہوں کہ شاہ صاحب نے ویدانتی فلسفہ اور اسلامی فلسفہ کا جوڑ لگا کر نئی ہندی قومیت کے لئے فکری اساس فراہم کرنے کی کوئی کوشش کی تھی۔ مجھے ان کی کتابوں میں اس کوشش کا کہیں سراغ نہ ملا۔ اور اگر مل جاتا تو باللہ العظیم کہ میں شاہ صاحب کو مجددین کی فہرست سے خارج کر کے متحد دین کی صف میں لے جا کر بٹھاتا۔

مابعد الطبعی بنیاد کو استوار کرنے کے بعد وہ اس پر ایک نظام اخلاق مرتب کرتے ہیں اور اس مقام پر انتہائی جذبہ اعتراف کے ساتھ میں دیکھتا ہوں کہ وہ یونانی آتھنکس کی غلامی سے پہلو پچا رہے ہیں، اس آتھنکس کی غلامی سے جس میں دو ڈانی جیسے لوگ جا پھنپے اور جس کا اچھا خاصا اثر امام

اگرچہ بار شاہ صاحب مذہب ہے بودہ باشد۔ وآنکہ گفتیم اجتهاد در ہر عصر فرض است، بجهت آنست کہ مسائل کثیرة التوقوع غیر محصور اند، و معرفت احکام الہی در انہا واجب، و آنچه مسطور و مدون شدہ است غیر کافی، و در انہا اختلاف بسیار کہ بدون رجوع بادلہ حل اختلاف آن نتواں کرد، و طرق آن تا مجتہدین غالباً منقطع، پس بغیر عرض بر قواعد اجتهاد است نیاید۔

یہی نہیں کہ شاہ صاحب نے اجتهاد پر محض زور ہی دیا ہو، بلکہ انھوں نے پوری تفصیل کے ساتھ اجتهاد کے اصول و قواعد اور اس کی شرائط کو بیان بھی کیا ہے، از لہ جہت، عقد الجید، انصاف، بدور بازغہ مصطفیٰ وغیرہ میں اس مسئلہ پر کہیں اشارات اور کہیں مفصل تقریریں موجود ہیں۔ نیز اپنی کتابوں میں جہاں بھی انھوں نے کسی مسئلہ پر گفتگو کی ہے ایک محقق اور مجتہد کی حیثیت سے کی ہے، گویا ان کی کتابوں کے مطالعہ سے آدمی کو نہ صرف اجتهاد کے اصول معلوم ہو سکتے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ اس کی ترتیب بھی مل جاتی ہے۔

مذکورہ بالا دو کام تو ایسے ہیں جو شاہ صاحب سے پہلے بھی لوگوں نے کئے ہیں، مگر جو کام ان سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا وہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو ایک مرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس میں وہ اپنے تمام پیش رووں سے بازی لے گئے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی تین چار صدیوں میں بکثرت ایسے ائمہ گزرے ہیں جن کے کام کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اسلام کے نظام حیات کا مکمل تصور رکھتے ہیں اور اسی طرح بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین بنتے ہیں جن کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس تصور سے خالی تھے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت ایک نظام کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ شرف شاہ ولی الہی کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ اس راہ میں پیش قدمی کریں۔ ان کی کتابوں میں سے جہت اللہ اور البدور البازغہ، دونوں کا موضوع یہی ہے۔ پہلی کتاب زیادہ

غزالی تک کے ذہن پر قائم رہا۔ مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ شاہ صاحب اس آئینہ کے اثر سے بالکل آزاد ہو چکے تھے۔

نظام اخلاق پر وہ ایک اجتماعی فلسفہ (Social Philosophy) کی عمارت اٹھاتے ہیں جس کے لیے انھوں نے ارتقاعات کا عنوان تجویز کیا ہے، اور اس سلسلہ میں تدبیر منزل، آداب معاشرت، سیاست مدن، عدالت، ضرب محاصل (Taxation) انتظام ملکی اور تنظیم عسکری وغیرہ کی تفصیلات کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں جن سے تمدن میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

اسی موضوع پر۔ اس کتاب میں وہ احادیث سے ثابت کرتے ہیں کہ خلافت اسلامی اور پادشاہی دو بالکل مختلف الاصل چیزیں ہیں۔ پھر ایک طرف پادشاہی کو اور ان تمام فتنوں کو رکھتے ہیں جو پادشاہی کے ساتھ مسلمانوں کی حیات اجتماعی میں از روئے تاریخ پیدا ہوئے اور دوسری طرف خلافت اسلامی کی خصوصیات اور شرائط کو اور ان رحمتوں کو پیش کر دیتے ہیں جو اسلامی خلافت میں فی الواقع مسلمانوں پر نازل ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد کس طرح ممکن تھا کہ لوگ چین سے بیٹھ جاتے۔

(۱) پیدائش ۱۱۱۲ھ - ۱۰۷۳ء - وفات ۱۱۷۶ھ - ۱۱۷۳ء

(۲) تہذیبات جلد اول صفحہ ۱۰۱ :- فلو فرض ان یکون هذا الرجل فی زمان واقضت الاسباب ان یکون اصلاح الناس باقامة الحروب ونفث فی قلبه اصلاحهم لقام هذا الرجل بامر الحرب اتم قیام وکان اماما فی الحرب لایقاس بالرسنم والاسفندیار بل الرسم والاسفندیار وغیرہما طفیلیوں علیہ مستمدوں منہ مقتدون بہ۔

(۳) مولانا محمد منظور صاحب مدیر "الفرقان" نے مجھے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ شاہ

صاحب اور ان کے خاندان کے متعلق یہ روایات کچھ زیادہ معتبر نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بیانات یا ان میں سے اکثر غلط ہوں۔ مجھے ان کے صحیح ہونے پر اصرار نہیں ہے۔ مگر جو بات میں ثابت کرنا چاہتا ہوں وہ بجا ہے خود حقیقت ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ساری زندگی اس پر شاہد ہے کہ وہ تمام عمر تنقید اور تعمیر افکار کے کام میں منہمک رہے اور دعوت عامہ کی طرف توجہ کرنے کا ان کو موقع ہی نہیں ملا۔ تعمیر و تعمیر فکر اپنی جگہ خود ایک بہت بڑا کام ہے اور دعوت عامہ کا کام اسے مختلف ایک دوسری نوعیت کا کام ہے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص یہ دونوں کام ایک ساتھ انجام دے سکے۔ اور اگر کسی شخص نے صرف پہلا کام کیا ہو اور دوسرا کام نہ کر سکا ہو تو اس سے اس کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

(۴) میری پیش نظر ۱۲۸۲ھ کا نسخہ ہے جو بریل میں طبع ہوا ہے۔

(۵) یعنی یہ مسئلہ کہ دس ہاتھ لہب اس ہاتھ چوڑا حوض ہو تب اس کا پانی ماء کثیر ہوگا۔

(۶) یعنی یہ مسئلہ کہ کنوئیں میں کس جانور کے گرنے پر کتنے ڈول پانی کے نکالے جائیں۔

(۷) جو فلسفہ مسلمانوں میں رائج تھا وہ اسلام کی عملی، اخلاقی اور اعتقادی نظام سے کوئی ربط نہیں رکھتا تھا، اس وجہ سے اس کا رواج جتنا جتنا بڑھا اسی قدر مسلمانوں کی زندگی گہڑتی چلی گئی، عقیدہ بھی کمزور ہوا، اخلاق بھی ڈھیلے ہوئے اور قوائے عمل بھی سرد ہو گئے۔ ذہن میں متضاد خیالات کی کشمکش کا یہ طبیعی نتیجہ ہے۔ اور یہی اثر اب موجودہ مغربی فلسفہ کے رواج سے بھی رونما ہو رہا ہے، کیونکہ وہ بھی کسی طرح نظام اسلامی کی فکری اساس نہیں بن سکتا۔

☆☆☆

پھر وہ نظام شریعت، عبادات، احکام اور قوانین کو پیش کرتے ہیں اور ہر ایک چیز کی حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں اس خاص مضمون پر جو کام انھوں نے کیا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے جو ان سے پہلے امام غزالی نے کیا تھا اور قدرتی بات ہے کہ وہ اس راہ میں امام موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ !

آخر میں انھوں نے تاریخ کا ملل و شرائع پر بھی نظر ڈالی ہے اور کم از کم میرے علم کی حد تک وہ پہلے شخص ہیں جس نے اسلام و جاہلیت کی تاریخی کشمکش کا ایک دھندلا سا تصور پیش کیا ہے۔

نظام اسلامی کے اس قدر معقول اور اتنے مرتب خاکے کا پیش ہو جانا بجا ہے خود اس امر کی پوری ضمانت ہے کہ وہ تمام صحیح الفطرت اور سلیم الطبع لوگوں کا نصب العین بن جائے اور جو لوگ ان میں سے زیادہ قوت عمل رکھتے ہوں وہ اس نصب العین کے لئے جان و تن کی بازی لگا دیں، خواہ اس نصب العین کو سامنے رکھنے والا خود عملاً ایسی کسی تحریک کی رہنمائی کرے یا نہ کرے۔ مگر جو چیز اس سے بھی زیادہ محرک ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ شاہ صاحب نے جاہلی حکومت اور اسلامی حکومت کے فرق کو بالکل نمایاں کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دیا، اور نہ صرف اسلامی حکومت کی خصوصیات صاف صاف بیان کیں، بلکہ اس بحث کو بتکرار ایسے طریقوں سے پیش کیا جن کی وجہ سے اصحاب ایمان کے لئے جاہلی حکومت کو اسلامی حکومت سے بدلنے کی جدوجہد کیے بغیر چین سے بیٹھنا محال ہو گیا، یہ مضمون حجت میں بھی کافی تفصیل کے ساتھ آیا ہے، مگر ازالہ تو گویا ہے ہی

حضرت شاہ ولی اللہ بحیثیت مصنف

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

تشریح مطالب میں موشگافی، سنن کا اختصار اور مطالب کی تلخیص یا اشارحانہ اور فحش یا نگرہ کشائی اور نکتہ رسی میں سے کوئی چیز نہیں ہے، یہ سب کمالات اپنی جگہ پر مسلم اور یہ تمام علمی خدمات اپنے اپنے زمانہ میں لائق احترام و شکر، لیکن تجدید و امامت کا مقام اس سے بلند ہے ہر مصنف امام وقت اور مجدد فن نہیں ہوتا۔ اس مقام کے لئے شرط ہے کہ مصنف نے کسی موضوع پر کوئی ایسی چیز پیش کی ہو جس سے اس وقت تک کا کتب خانہ خالی ہو، نئے علمی نظریات اور (علم دین کے حدود کے اندر رہ کر) تازہ خیالات اور جدید تحقیقات پیش کی ہوں، اس کے یہاں جدت فکر ہو، ذہن کا اجتہاد ہو اور مضامین و مطالب میں اصلیت اور اولیت ہو، اگر تنہا یہی شرط ہے کہ تو علامہ ابن خلدون ایسے مصنف کی بہترین مثال ہے۔

لیکن اگر ”فکر ارجمند“ کے ساتھ ”دل دردمند“ اور عقل کے ساتھ عشق جمع ہو جائے اور مصنف کا قلم نغمہ زن کی انگلی کی طرح ارباب دل کے تاروں کے ساتھ کھیلنے لگے تو وہ صرف مصنف نہیں رہتا، بلکہ ایک اخلاقی اور دینی مصلح بھی بن جاتا ہے امام غزالی کی بعض تصنیفات میں یہ رنگ پایا جاتا ہے۔

لیکن اگر علم و استدلال کے ساتھ کوئی صحیح دینی تحریک و دعوت کوئی اصلاحی جوش اور کسی صالح انقلاب کی خواہش شامل ہو جانے اور اس کی تحریروں اور تصنیفات سے کسی نئی دور کا آغاز اور کسی نئی جماعت کی پیدائش کا سامان ہو تو وہ مجدد کہلانے کا مستحق ہوتا ہے، امام ابن تیمیہ اور حضرت مجدد سرہندی اس کی مثال ہیں۔

ہمارے نزدیک شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان میں سے اکثر

یہ سب جانتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ اسلام کے ان جلیل القدر عالموں میں سے ہیں جن کی شہرت و عظمت زمان و مکان کے حدود سے آگے بڑھ چکی ہے اور جن کا بیش قیمت علمی ترکہ ایک قوم اور اقلیم کی میراث نہیں بلکہ پوری امت اسلامیہ اور پورے عالم اسلام کا سرمایہ فخر ہے لیکن اس علمی حقیقت تک ان لوگوں کی رسائی جن کو شاہ صاحب کے خارق عادت علمی و ذہنی کمالات کا مشاہدہ (بعد زمانی یا بعد مکانی کیوجہ سے) نصیب نہیں ہو سکا آپ کی تصانیف ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اس لئے آپ کی تصنیفی خصوصیات کی وضاحت اور مصنف کی حیثیت سے اسلام کی علمی و دینی تاریخ میں آپ کے مقام کی تشریح۔ آپ کی صحیح معرفت کے لئے ضروری اور نہایت اہم علمی موضوع ہے جس کے بغیر نہ صرف آپ کا تذکرہ نہ صرف ہندوستان کی علمی تاریخ بلکہ اسلام کی علمی تاریخ بھی نامکمل رہے گی۔

شاہ صاحب کا مرتبہ مصنف کی حیثیت سے

شاہ صاحب اسلام کے ان چند مصنفین میں سے ہیں جن کی تعداد مصنفین اسلام کے بے نظیر کثرت کے باوجود بہت کم ہے، حاشا و کلا یہ اسلام کے مشہور تاریخی فخر اور امتیاز کا انکار اور مصنفین اسلام کی تنقیص نہیں ہے۔ دنیا کے کسی مذہب کی علمی تاریخ اتنے اہل قلم، اتنے صاحب تصنیف اور تاریخ کی اتنی مختصر مدت میں اتنا وسیع، معمور اور قیمتی کتب خانہ نہیں پیش کر سکتی جتنا اسلام نے پیش کیا، لیکن اس موقع پر ہمارے سامنے عظمت کا معیار تصانیف کی کثرت، موضوع کا تنوع، کتابوں کی ضخامت، تصانیف کی قبولیت اور رواج مضامین کا اشکال اور پیچیدگی، خیالات میں تعمق اور فہم یا

علوم منقولہ میں سے فن تفسیر کی طرف بھی پوری توجہ ہوئی، مگر عرصہ تک مصنفین کا نقطہ نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رہا کہ آیات سے متعلق زیادہ سے زیادہ ممکن مواد جمع کر دیں۔ اور یہ کام بعد کے آنے والوں کے لئے جن کے سامنے وہ ماخذ نہیں ہیں بہت مفید اور ضروری ہے لیکن ان میں ذاتی تفکر، زندگی اور ماحول پر ان کی تطبیق اور بیشتر کتابوں میں تنقیح کی کمی اور بعض میں اپنے زمانہ کے فانی اور وقتی خیالات و نظریات سے تاثر کی زیادتی اور اپنے زمانہ کا عکس ہے اس دور میں اصول تفسیر کی عدم تدوین اور اس پر کسی معتد بہ کتاب کا نہ ہونا بھی ایک محسوس کمی ہے۔

دوسری صدی کی ابتدا ہی میں ابتداء مختلف قوموں کے اختلاط اور مختلف مذاہب کے اجتماع سے اور بعد میں یونانی فلسفہ اور خیالات کی وجہ سے مسلمانوں میں ایک نہایت خام قسم کی عقلیت پیدا ہوئی جس میں کسی قسم کی گہرائی اور پختگی نہیں تھی اور جو فرد یا قوم کی نوعی یا ذہنی مرعوبیت کی حالت میں کبھی کبھی پیدا ہو جایا کرتی ہے اس لئے اس موضوع پر ہمیں معتزلہ سے لے کر فلاسفہ تک (بشمول ابن سینا اور ابن رشد) کسی کی تصنیف میں کوئی جدت فکر، اجتہاد، اور ارسطو کے فلسفہ میں کوئی اضافہ یا ترمیم یا کسی انقلابی کوشش کا نشان نہیں ملتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں یونانی فلسفہ اور اسلام کے تقابل میں وہ حریت فکر بھی نہیں جس کے یہ سب سے بڑے مدعی ہیں۔

اس فلسفہ کے مقابلہ میں علم کلام پیدا ہوا اور اصول فقہ کے بعد یہ دوسرا فن ہے جس میں مسلمانوں کی ذکاوت صرف ہوئی امام ابو الحسن اشعری (المتوفی ۲۴۰ھ) اور امام ابو منصور ماتریدی (المتوفی ۳۳۳ھ) کی تصنیفات اور امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی جارحانہ اور امام رازی (م ۶۰۶ھ) کی مدافعانہ کوششیں اس سلسلہ میں ناقابل فراموش ہیں۔

فلسفہ اور علم کلام کے تقابل میں جو خاص قسم کی ذہنی پیچیدگیاں، غلط مذہبی نظریات و تصورات اور دوسری طرف اسلام کے ضعف اور بعد زمانہ سے بدعات اور مشرکانہ خیالات پیدا ہو گئے تھے انکا اقتضا تھا کہ ایسے اشخاص پیدا ہوں جو سنت کا احیاء کریں، عقل و نقل کے اس معرکہ میں اسلامی عقائد و مسائل کی حکیمانہ تشریح کریں اور خالص اور قدیم اسلام کی طرف دعوت دیں یہ خدمت آٹھویں صدی میں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید

کلمات کے جامع ہیں اسلام کے باکمال مصنفین کی خواہ کتنی ہی مختصر فہرست بنائی جائے، آپ کے نام کے بغیر وہ نامکمل رہے گی اور ترتیب و مراتب کے لحاظ سے آپ کا نام اتنا پیچھے نہیں رہے گا جتنا کہ تاریخ کے لحاظ سے آپ کا زمانہ پیچھے ہے۔

وانی وان كنت الاخير زمانه

لات بما لم تستطعه الاوائل

لیکن اس کے قبل کہ ہم شاہ صاحب کی تصنیفی خصوصیات کی طرف اشارہ کریں ہم اسلام کی ہزار سالہ تصنیفی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ شاہ صاحب سے پہلے جتنا علمی کام ہو چکا تھا نیز تصنیف کا ارتقا و انحطاط ہمارے سامنے رہے۔

اسلام کی تصنیفی تاریخ پر ایک نظر

مسلمانوں کی تصنیفی تاریخ حدیث اور متعلقات قرآن سے شروع ہوتی ہے، اس لئے طبعی طور پر ان کی تصنیفی کاوشوں کا موضوع اور ان کی دماغی جولانیوں کا میدان، نقل و روایات، جمع و ترتیب کا میدان تھا۔ اور اس میں انھوں نے اس تحقیق و تفتیش اس دیانت و احتیاط کا ثبوت دیا جس کی زیادہ سے زیادہ کسی انسان سے توقع کی جاسکتی ہے، چوتھی صدی ہجری تک کی بہترین اسلامی تصنیفات اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔

دینی و مدنی ضرورتوں سے فقہ کا علم پیدا ہوا اور علماء نے دوسری ہی صدی سے اس میں مجتہدانہ تصنیفات کیں جن میں سے قدیم کتابوں میں سے امام شافعی کی بے نظیر کتاب ”کتاب الام“ اور اس کے بعد ابن قدامہ حنبلی کی جلیل القدر تصنیف المغنی اور پچھلی صدیوں میں احناف کی مایہ ناز کتاب ہدایہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

مسائل کے استنباط اور قیاس و اجتہاد کے سلسلہ میں ضروری طور پر اصول فقہ کی طرف توجہ ہوئی اور بہت جلد مسلمانوں نے اس کو اتنی ترقی دی کہ غالباً کسی مذہب و قوم کے اصول تشریح و قانون سازی نے اتنی ترقی نہ حاصل کی ہوگی۔ اس فن میں مسلمانوں کی بہترین دماغی جودت صرف ہوئی، اور وہ ان کی ذہانت کا بہترین نمونہ ہے امام غزالی کی مصحفی اور علماء احناف اور شافعیہ کی طویل و متوحط کتابیں اس کا ثبوت ہیں۔

علامہ ابن قیم نے اپنی عالمانہ تصنیفات کے ذریعہ انجام دی رحیم اللہ۔

اس کے بعد سے خلاف وجدلیات اور مذہبی مباحث اور علمی مناظروں کا دور شروع ہوا۔ اور بہترین قوتیں اس میں صرف ہونے لگیں۔ اسی دور میں حدیث کے متعلقات پر بعض نہایت بیش قیمت اور جلیل القدر تصنیفات ہوئیں جن میں سے صحیح بخاری کی شرح فتح الباری خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

اس کے بعد سے تمام عالم اسلامی میں ایک عام علمی انحطاط اور تصنیفی زوال شروع ہوا۔ جو بارہویں صدی تک قائم رہا۔ اجتہاد و فکر کی قوت جاتی رہی، علم میں تقلید شعار بن گیا۔ فنون کی شرح و تخلص مال کا رہ گیا۔ اور علما پر "مدرست" طاری ہو گئی۔ مدرسائے تصنیفات اور متعلق درسی کتابیں سرمایہ فخر ہو گئیں، ہمتیں پست ہو گئیں، شرح و تلخیص اور اس کے بعد صرف تحشیہ پر قناعت کی جانے لگی۔ بحث و نظر کا میدان تنگ سے تنگ اور فکر کا دائرہ محدود سے محدود ہوتا گیا۔ علوم معقول بھی منقول بن گئے نقلیات میں میں فکر، عقلیات میں اجتہاد، قدیم علمی اندوختہ میں نئے اضافے اور طریق بحث و استدلال میں تغیر کی رسم موقوف ہو گئی گیر ہویں اور بارہویں صدی کے عرب اور ہندوستانی علماء و مصنفین کے تذکیری ملاحظہ ہوں، کوئی مجتہد تصنیف اور کوئی نایاب علمی تحقیق نہیں ملے گی۔

علم و تصنیف کے اس دور انحطاط میں شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے لیکن وہ اپنے زمانہ کی پیداوار نہیں ہیں، ان کی ذہنی سطح ان کے مدارک ان کے علوم و معارف اپنے زمانہ کے علم علماء کی سطح سے بہت بلند تھے اور وہ ان اشخاص میں تھے جو کئی کئی سو برس کے بعد اپنے زمانہ کی بالکل بخلاف اہل زمانہ سے بالکل مختلف پیدا ہوتے ہیں اور ان کو بقر میں اور نوالغ کہا جاتا ہے، شاہ صاحب خود اپنے الفاظ میں اسی "تخریج بر تخریج اور تفریع بر تفریع" کے دور میں پیدا ہوئے (ازالۃ الخفاص ۱۵۷) لیکن آپ کی تصنیفات اپنے زمانہ کی عام روش سے بالکل علیحدہ، آپ کی طرز فکر و بحث جدا، اور آپ کے مضامین ان لوگوں کے لئے جن کے معلومات عام درسی کتابوں تک محدود ہیں بالکل نئے ہیں، چنانچہ خود آپ کو اس کا احساس تھا اور جا بجا آپ نے اس کا اظہار فرمایا ہے ازالۃ الخفاص میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"چوں ایں مقدمہ باین آب و تاب در کتب کلامیہ نخواندہ
مکتتمل کہ وحشتے بخاطر تو راہ یابد"
دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"ولابد چوں ایں ہفت نکتہ گفتہ شد باید دانست کہ مفہوم خلافت
خاصہ برنجی کہ بیان کردیم علمی ست شریف کہ نور تو فتنی آزار
خاطر بندہ ضعیف ریختہ بستعظمہ من یعرفہ وینکرہ
من لا یعرفہ وذلک من فضل اللہ علینا وعلی
الناس ولكن اکثر الناس لا یشکرون"

اس موقع پر جہاں یہ ثابت کر رہے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی حیثیت
مجتہدین امت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسی مجتہد مستقل کی منتسب مجتہدین
کے مقابلہ میں ہوتی ہے لکھتے ہیں:-

"لیکن فہم ایں معنی بغایت دقیق است جمعے کہ سرمایہ علم ایشان
شرح وقایہ و ہدایتہ باشد کجا ادراک ایں سردیق تو اتند کردہ"
(ازالۃ الخفاص ج ۲ ص ۸۴)

اب ہم اپنی حیثیت کے مطابق شاہ صاحب کی خصوصیات تصنیف
بیان کرتے ہیں:-

خصوصیات تصنیف

سبقت و اولیت:- اسلامی مسائل کی حکیمانہ توجیہ و تشریح اور تطبیق عقل
و نقل اگرچہ بارہویں صدی کے عالم کیلئے بالکل نیا موضوع نہیں تھا، خود شاہ
صاحب نے حجۃ اللہ کے مقدمہ میں امام غزالی، خطابی اور شیخ الاسلام عز الدین بن
عبدالسلام کا نام لیا ہے، جنہوں نے احکام شرعی کے حکم و مصالح بیان کئے ہیں
لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان بزرگوں نے جو کچھ لکھا اس کی حیثیت اشارات و نکات
سے زیادہ نہیں ہے، اسلام کے پورے نظام شرعی کی حکیمانہ تشریح میں شاہ
صاحب سے پہلے نہیں ملتی۔ اس اہتمام، وسعت اور جامعیت کے ساتھ اس
موضوع پر ہمارے علم میں حجۃ اللہ الباقیہ پہلی تصنیف ہے، اور پھر اس کے اکثر
ابواب و مضامین بالکل نئے ہیں اور فلسفہ، علم کلام، قرآن و حدیث، تصوف اور
ذاتی غور و مشاہدہ اور قوت استدلال کی آمیزش شاہ صاحب ہی کا حق ہے۔

اصول تفسیر پر کوئی چیز عام طور پر نہیں ملتی، صرف چند اصول و قواعد

کی عمدہ تحقیقات میں سے ہے۔

نحو کے مشہور اور ظاہری قواعد کی بعض آیات سے بظاہر عدم مطابقت کی جو توجیہ شاہ صاحب نے کی ہے (ص ۲۲ حجتیائی) اس کی قدر وہ لوگ کر سکتے ہیں جو نحو کی تدوین کی تاریخ سے واقف اور بصیرہ اور کوفہ کے دبستان کے اختلافات پر نظر رکھتے ہیں۔

بہر حال اس کتاب کا ہمارے ہاتھوں میں ہونا خدا کی ایک نعمت اور اس کا ہمارے نصاب درس میں عام طور پر داخل نہ ہونا اس نعمت کی ناقدری، اور ناواقفیت یا بد مذاقی ہے۔

خلیفہ کے شرائط اور اس کے احکام پر اگر چہ جتہ جتہ چیزیں، فقہ اور علم کلام کی کتابوں میں ملتی ہیں مگر اسلام کے نظام حکومت کی تشریح اور خلافت عامہ اور خلافت خاصہ کی تقسیم اور ان کے جداگانہ اوصاف کا بیان ازالہ الخفا کے سوا کہیں نہیں، نیز قرآن سے خلافت راشدہ کے اثبات میں شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے تفردات میں سے ہے۔

رسالہ انصاف اور حجتہ اللہ کے محدثانہ ابواب میں شاہ صاحب نے مذاہب کے اختلاف کے اسباب اور اس کی تاریخ کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی سلامت فہم، اصابت رائے اور وقت نظر نیز وسعت قلب کی بہترین دلیل ہے اور اس طرز پر اس سے پہلے کسی عالم کی تحریر دیکھنے میں نہیں آئی۔

اس سبقت و اولیت کے علاوہ اگر ہم شاہ صاحب کی دوسری تصنیفی خصوصیات کو مختصر الفاظ میں بیان کریں تو وہ یہ ہونگی (۱) وقت نظر (۲) وسعت نظر (۳) سلامت فہم (۴) سلاست بیان، (۵) قوت انشاء و تعبیر۔ ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ تشریح کرنے کے بجائے ہم شاہ صاحب کی دو حرکتہ الاراء کتابوں (حجتہ اللہ البالغہ اور ازالہ الخفا) پر تبصرہ کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کے مقام کے سمجھنے کیلئے ان دو کتابوں کا پڑھنا کافی ہے۔

حجتہ اللہ البالغہ

شاہ صاحب کی یہ مایہ ناز تصنیف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان معجزات میں سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے امتیوں کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے، اور جن سے اپنے وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز نمایاں اور اللہ کی حجت تمام ہوئی، بارہویں صدی کے کچھ بعد ہندوستان اور تمام اسلامی ممالک میں ”عقلیت“ کا جو دور شروع

تفاسیر کے مقدمہ میں یا اپنا طرز تصنیف بیان کرنے کے لئے بعض مصنفین چند سطروں میں لکھ دیتے ہیں، شاہ صاحب کی کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن پوری کتاب سراسر نکات و کلیات ہے، درحقیقت ایک جلیل القدر عالم کو جس کو فہم قرآن کے مشکلات کا عملی تجربہ ہے ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے اس کی قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کو ان مشکلات سے واسطہ پڑا ہو بعض بعض اصول جو شاہ صاحب نے اپنے ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بناء پر لکھ دیئے ہیں دوسری کتابوں کے سینکڑوں صفحات کے مطالعہ سے نہیں حاصل ہو سکتے، اسی رسالہ کے مقدمہ میں شاہ صاحب کا یہ فرمانا حرف بحرف صحیح ہے کہ:

”میگوید فقیر ولی اللہ بن عبد الرحیم عاملہما اللہ تعالیٰ بلطفہ العظیم چون بریں فقیر دردی از فہم کتاب اللہ کشاوند خواست کہ بعضے نکات نافعہ کہ در تدبر کلام اللہ یار ان را بکار آید در رسالہ مختصرے مضبوط نماید امید واری از عنایت حضرت باری آن است کہ طالب علمان را بہ مجرد فہم ایں قواعد را بہ واسطہ در فہم معانی کتاب اللہ کشادہ گردد کہ اگر عمرے در مطالعہ تفاسیر یا گزرانیدن آنتہا بر مفسران علی انہم اقل قلیل فی ہذا الزمان بسر برند بان ضبط و ربط بدست نیارند۔“

قرآن کے مضامین و مقاصد، اس کے طرز اسلوب کی خصوصیت اور انسانی تالیفات خصوصاً متاخرین کی کتب درسیہ سے اس کے اختلاف اور شان نزول کے متعلق چند لفظوں میں جو کچھ لکھا ہے، آج اس میں ممکن ہے کوئی ندرت نہ معلوم ہو، لیکن بارہویں صدی میں یہ قطعاً نئے خیالات تھے اور آج بھی کتنے حلقوں میں یہ خیالات نامانوس ہیں۔

قرآن مجید نے جن فرقوں کی تردید کی ہے ان کے اصلی اور صحیح خیالات و عقائد اور کمزوریوں کا بیان ان کی گمراہیوں اور غلط فہمیوں کے حقیقی اسباب اور ان کی تاریخ نفاق کی تشریح اور مسلمانوں کی بعض جماعتوں پر ان کی تطبیق فہم قرآن کی اساس ہے جو اختصار کے باوجود اس وضاحت کے ساتھ کسی بڑی سے بڑی تفسیر میں نہیں ملے گی۔

نسخ میں متقدمین و متاخرین کے اصطلاحی فرق کی توضیح اور منسوخ و ناسخ آیات میں تطبیق صحابہ و تابعین کے تفسیری اختلافات کا حل شاہ صاحب

کی کتابوں میں نہیں مل سکتے اور اس میں بعض حقائق ایسے آگے ہیں جو اصول و کلیات کا حکم رکھتے ہیں اور جن کے نہ جاننے کی وجہ سے بڑی بڑی غلط فہمیاں اور بے اعتدالیاں ہوتی ہیں۔

تمتہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں شاہ صاحب کی وسعت نظر اور وسعت قلب کی بہترین دلیل ہے اور اس سے شاہ صاحب کا ذوق حدیث، کتب حدیث کی محبت اور مسلک اجتہاد معلوم ہوتا ہے کہ جو ان کا اصل ذوق اور مسلک ہے۔

شاہ صاحب کی عربیت

اس موقع پر نامناسب نہ ہو گا اگر ہم شاہ صاحب کے ایک اور امتیازی کی طرف بھی اشارہ کر دیں جس میں شاہ صاحب نے صرف اپنے زمانہ میں بلکہ ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ میں منفرد ہیں وہ شاہ صاحب کی عربیت اور عربی میں قدرت تحریر ہے۔

اہل نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ہمارے ملک میں اسلام کے دوسرے مفتوحہ ممالک کی طرح کبھی بھی عربی کا صحیح اور اعلیٰ ذوق نہیں رہا، یہ نظری ذوق اگر کبھی رہا بھی ہو تو اس میں شبہ نہیں کہ تحریر میں عربیت اور قدرتِ بیاں بہت نایاب رہی، اگر تاریخی جستجو کی جائے تو میر غلام علی آزاد بلگرامی اور بعض ایسے ہندوستانی مصنفین کو چھوڑ کر جن کی زندگی کا بڑا حصہ عرب ممالک اور عرب فضلا کی صحبت میں گزرا ایسے مصنفین کا ملنا مشکل ہے جن کی عربی تحریر، ادبی اسقام سے پاک، عربی ذوق کے مطابق اور سلیس و رواں ہو، نصاب درس کی مخصوص ساخت اور ہندوستان میں عربی نظم (مجتہبی وسیع معلقہ و حماسہ) کے نمونوں کی زیادتی اور خوبی کی وجہ سے ہندوستانی علماء کی نظم ان کی عربی نثر سے کہیں بہتر ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف (بالخصوص حجتہ اللہ الباقیہ میں) اہل زبان کی سی روانی و قدرت اور ادبائے عرب کی سی عربیت ہے اور وہ ان بے اعتدالیوں سے پاک ہیں جو عجمی علماء کی عربی تحریر میں پائی جاتی ہیں۔

ہم ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں اور یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ علمی اور سنجیدہ مضامین پر مقدمہ ابن خلدون کے بعد حجتہ اللہ الباقیہ عربی نثر و تحریر کا پہلا کامیاب نمونہ ہے۔ بلکہ بعض اہل ذوق کا خیال ہے کہ مقدمہ

ہونے والا تھا اور احکام و شرائع کے اسرار و مصالح کی جستجو کا جو عام ذوق پیدا ہونے والا تھا، اس کا یہی اقتضا تھا کہ اس دور کے شروع ہونے سے پہلے بارہویں صدی کے امام کے قلم سے ایسی کتاب لکھوادی جائے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے حجتہ اللہ کے دیباچہ میں ان فیہی اشارات اور بشارتوں کا ذکر کیا ہے جو اس خیال کی محرم ہوئیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کام میں کس قدر فیہی تحریک و تائید شامل تھی۔

ہمارے علم میں کئی مذہب کی تائید، اس کی حکیمانہ توجیہ اور کسی مذہبی نظام کی فلسفیانہ تشریح میں کسی زمانہ میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی یا اگر لکھی گئی تو دنیا کے سامنے نہیں، اسلام کے معاشی و سیاسی نظام پر بھی جا بجا اشارات اور تشریح نکات ہیں ان کو اگر ازالۃ الخفاء اور دوسری تصنیفات کے اشارات و نکات کے ساتھ جمع کر لیا جائے تو وہ بڑے کام کی چیز ہو سکتی ہے اور تشریح و تفصیل کے لئے ایک اچھا متن بن سکتا ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں اس کتاب پر تبصرہ کرنا اور اس کے محاسن کو نمایاں کرنا بہت مشکل ہے پھر ہر شخص کا ذوق، نقطہ نظر، اس کی مشکلات اور ان کے حل کی راہ جدا ہے اس لئے اپنے ذوق کے مطابق اس کتاب کے بعض ابواب پر ہم ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

بحث اول کے تمام ابواب تقریباً شاہ صاحب کے تفردات میں سے ہیں، تکلیف و مجازات پر اعلیٰ متکلمانہ اور حکیمانہ بحث ہے جس سے بہت سے عقدے کھل جاتے ہیں، انسانوں کی صلاحیت و استعداد کے مدارج اور فطری تفاوت اور ملکیت و بہمیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے شاہ صاحب کی کمال نکتہ دانی اور نفسیات و طبائع انسانی کا وسیع اور عمیق مطالعہ معلوم ہوتا ہے۔ بحث خامس میں دوسری مفید بحثوں کے علاوہ ”معاصی و آثام“ پر سیر حاصل بحث ہے۔

بحث سادس اول سے لیکر آخر تک بے نظیر ہے اس بحث کو پڑھ کر شاہ صاحب کی دقیقہ رسی کے ساتھ غایت درجہ کا سلاست فہم بھی معلوم ہوتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب مذہب کی تاریخ اور ”طبائع و نفسیات ادیان“ نیز تشریح اور قانون سازی کی باریکیوں پر کتنی گہری نظر رکھتے ہیں یہ پورا باب مجتہدانہ اور حجتہ اللہ کے محاسن میں سے ہے۔

بحث سابع میں جو مضامین و نکات آگے ہیں وہ عام طور پر اصول فقہ

(۲) خلفاء راشدین کی خلافت کا ثبوت قرآن مجید سے اس کتاب کی بہترین بحثوں میں سے ہے جو نکات و حقائق سے لبریز ہے، خصوصاً آیت تمکین، آیت استخلاف، آیت اذن قتال، آیت اعراب (قل السمخلفین من الاعراب) آیات (محمد رسول اللہ والذین معہ) آیت (یریدون لیطفنوا نور اللہ) آیت شوری (سورہ شوری) (لازالہ ص ۱۷۸-۱۷۹) کی جیسی تفسیر کی ہے اور اس کے ضمن میں قلم سے جو نکات و معارف نکل گئے ہیں۔ وہ کسی بڑی سی بڑی تفسیر میں نہیں مل سکتے۔ خلفاء کے فضائل اور بشارات میں جو روایات ہیں البتہ وہ کہیں کہیں تحقیق و تنقیح کے قابل ہیں۔

(۳) نبی، خلیفہ، محدث اور صدیق کی تعریف ان کے اوصاف اور خلافت خاصہ کی تشریح شاہ صاحب کا خاص موضوع اور اس کتاب کا خاص مضمون ہے۔

(۴) اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اسلام کی دینی تاریخی و مذہبی انقلاب و تغیر کا ابھرا ہوا خاکہ ہے، اسلام کی سیاسی و علمی تاریخیں تو بے شمار ہیں لیکن ایسی تاریخ کہیں نہیں ملتی، کتابوں میں منتشر مواد ملتا ہے اس کتاب میں بھی اس موضوع کے متعلق بہت سا مواد جمع کر دیا ہے مثلاً اگر آپ جاننا چاہیں کہ دینی انحطاط تدریج کے ساتھ کس طرح ہوا اور اس کے مظاہر کیا تھے، کن کن چیزوں میں اصل معیار سے انحراف ہوا تو آپ ”خیر القرون“ سے متصل اور اس کے بعد کے فتنے (ازالہ الی تا ص ۱۲۲) خیر القرون اور شرف القرون کے احکام کا اختلاف (از ص ۱۳۶) اور ”تغییرات کلیہ“ کی بحثوں میں دیکھ سکتے ہیں اور اس سے ایک تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔

(۵) عام حقائق و معارف جو ساری کتاب میں پھیلے ہوئے ہیں خصوصاً کتاب کی فصل ہفتم میں جو پہلے حصہ کے ص ۲۵۵ سے پہلے حصہ کے خاتمہ تک ہے۔

(۶) خلفاء راشدین، خصوصاً شیخین اور بالآخر حضرت فاروق اعظم کے ولولہ انگیز اور ایمان افروز تاریخی حالات اور سیرت جس میں بڑے استقصا سے کام لیا گیا ہے اور بڑی اچھی ترتیب اور موثر انداز میں ان کو پیش کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ اس مختصر سے تعارف اور تبصرہ سے شاہ صاحب کا وہ مقام و مرتبہ واضح ہو جائے گا جو آپ کو اسلام کی علمی اور تصنیفی تاریخ سے حاصل ہے۔

ابن خلدوں میں ادبیت اور حجتہ اللہ میں سلاست زیادہ ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بارہویں صدی تک (بلکہ بعض مقامات پر اس وقت بھی) حریری کے مقامات عربی نثر کا واحد نمونہ تھا، مضامین و خیالات کے مقابلہ میں الفاظ اور محاسن لفظی کی ترجیح، قافیہ کی شدید پابندی، دائرہ خیال کی تنگی، مشکل و نامانوس اور پر شکوہ الفاظ کا استعمال اس طرز تحریر کی خصوصیات ہیں اس طرز تحریر پر بیرونی کے ساتھ سنجیدہ و وسیع علمی مضامین اور حکیمانہ خیالات کا اظہار بے حد مشکل ہے، تمام دنیا میں حریری ہی کا سکہ چلتا رہا، اور ”مقامات“ دماغوں پر چھائے رہی، قاضی فاضل نے اپنی قابلیت اور منصب وزارت کی وجہ سے اس طرز کو اور مقبول بنا دیا ابن خلدون پہلا شخص ہے جس نے اس لفظی طلسم کو توڑا اور ان پابندیوں سے آزاد ہو کر علمی و تاریخی اور فلسفیانہ مضامین کو جیتی جاگتی زبان میں ادا کیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ابن خلدون کے مقدمہ کے بعد پھر ہمیں اگر کوئی دوسری تصنیف اس طرز کی ملتی ہے تو اس طویل مدت میں صرف اسی ہندوستانی عالم کی تصنیف حجتہ اللہ الباغذ ہے۔ حدیث و فقہ کے مضامین کو سلیس عربی میں ادا کر دینا ایک عالم کیلئے بیشک کمال نہیں لیکن حجتہ اللہ کا بحث ثالث جس میں ارتقا قات کے ابواب ہیں ملاحظہ ہو، اسی طرح وہ دوسرے مضامین جس کیلئے شاہ صاحب کے سامنے کوئی دوسرا قدیم نمونہ نہیں تھا، شاہ صاحب کے ”نبوغ“ اور عبقریت کی دلیل ہیں۔

ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء

یہ شاہ صاحب کی دوسری معرکتہ الآرا تصنیف ہے اور اپنی بہت سی خصوصیات کی بنا پر اپنے موضوع پر غالباً پہلی اور یقیناً اس وقت تک آخری کتاب ہے۔ تمام کتاب وجد آفریں اور ولولہ انگیز علمی اور ذوقی نکات سے لبریز ہے جس کا پورا اندازہ پوری کتاب پڑھنے سے ہوتا ہے کوئی شخص بھی جو اس کتاب کے مقصد اور مصنف کے مسلک سے اختلاف رکھتا ہے اور انصاف کے ساتھ اس کتاب کے اکثر حصہ کے مطالعہ کی زحمت گوارا کرے تو اس کی خلفاء کی عظمت کا قائل ہو جانا پڑے گا۔

اس کتاب کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

(۱) اسلام میں صحابہ کرام کا مقام، ان کے فضائل ان کے حقوق اور اس کے متعلق مباحث پر بے نظیر گفتگو اور افادات

شاہ صاحب کا ایک علمی ماخذ

مولانا محمد اولیس ندوی گرامی

ہنگاموں سے پر شور تھا، فقہ و فتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکام و ارشادات اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے۔ (معارف نمبر ۵ جلد ۲۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ صاحب کا خاندان ہمیشہ سے علم و عمل کا مرکز رہا لیکن اصلاح و تجدید امت اور فقہ دین کی جو دولت شاہ صاحب کے حصہ میں آئی اس کی کوئی نظیر نہیں

شاہ صاحب کے ہندی اساتذہ میں آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب اور مولانا محمد افضل صاحب معروف بہ حاجی سیالکوٹی کے اسماء گرامی ملتے ہیں لیکن ان بزرگوں کے احوال میں بھی ہم کو کوئی ایسی نمایاں چیز نہیں ملتی ہے جس سے اندازہ ہو سکے کہ شاہ صاحب کے تجدیدی کارناموں میں ان کے اثرات کو کہاں تک دخل ہے۔

اصل یہ ہے کہ شاہ صاحب کی تحریک اصلاح و تجدید بڑی حد تک مرہون منت ہے ان علوم معارف کی جو خدا کے فضل و کرم سے ان پر منکشف ہوئے جن کا بار بار وہ اپنی مصنفات میں ذکر فرماتے ہیں شریعت کے اسرار و حقائق کے اس انکشاف نے شاہ صاحب کی دنیا بدل دی اور معاصرین تو درکنار وہ اپنے سلف و خلف دونوں سے بدرجہا بلند ہو گئے۔

دوسری چیز جس نے شاہ صاحب میں بلند نظری اور عالی ہمتی پیدا کی، ہمارے نزدیک وہ اکابر علمائے اسلام کے خیالات اور ان کی

حضرت شاہ صاحب نے اپنے متعلق تہمیدات میں ارشاد فرمایا تھا: برسر مردار دانند کہ اس حقیقت، بمردم برسائ کہ امروز وقت وقت تست وز ماں زماں تو! وائے برکے کہ زیر لوائے تو نہ باشد! میرے ذہن میں ڈالا گیا ہے کہ میں آدمیوں تک اس حقیقت کو پہنچا دوں کہ یہ زمانہ تیرا زمانہ اور یہ وقت تیرا وقت ہے، افسوس اس پر جو تیرے علم کے نیچے نہ ہو۔

یہ حقیقت جس طرح دنیا پر ظاہر ہو کر رہی وہ واقف کاروں سے پوشیدہ نہیں!

نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے بہت ہی سچ کہا تھا:

کہ اگر وجود اور صدر اول در زمانہ ماضی می بود امام الائمہ و تاج الجہدین شمرده می شد!

اگر شاہ صاحب صدر اول میں ہوتے تو امام الائمہ اور مجتہدوں کے سردار شمار ہوتے۔

حیرت ہوتی ہے کہ اس عہد میں ایسی جلیل القدر اور یگانہ روزگار ہستی ہندوستان میں پیدا کیسے ہوئی جب کہ حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کے الفاظ میں حال یہ تھا کہ

”مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا جھوٹے فقراء اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے

زندگیوں کا غیر متعصبانہ مطالعہ ہے۔

یوں تو شاہ صاحب کے پیش نظر متعدد علماء کی تصانیف معلوم ہوتی ہیں مثلاً علامہ عز الدین بن عبدالسلام، امام غزالی اور شیخ ابوطالب کی وغیرہ! لیکن ان علماء میں ایک ایسی عالی مقام ہستی کی زندگی اور اس کے خیالات بھی شاہ صاحب کے سامنے رہے جو تاریخ اسلام میں اپنی خصوصیات کے باعث بہت ہی ممتاز اور اہم درجہ رکھتی ہے جس کی ذات خود ایک عظیم الشان دعوت اصلاح و تجدید کا سبب بن چکی تھی اس سے ہماری مراد شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی ذات بابرکات ہے۔

۱۱۴۳ھ میں شاہ صاحب ہندوستان سے حجاز تشریف لے جاتے ہیں اور مشائخ حرمین سے استفادہ کرتے ہیں شاہ صاحب کے مشائخ حرمین میں شیخ ابراہیم کردی ایک بزرگ کا ذکر آتا ہے یہ وہی بزرگ ہیں جو شاہ صاحب کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ ولی اللہ الفاظ کی سند مجھ سے لیتے ہیں اور معنی کی سند میں ان سے لیتا ہوں۔

شیخ ابراہیم کردی ایک بلند نظر اور وسیع المشرب عالم تھے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے قدر دان بلکہ زبردست حامی تھے۔

ابن آلوسی بغدادی جلاء العینین ص ۲۶ میں ان کے متعلق لکھتے ہیں:

وكان سلفي العقيدة ذاباً عن شيخ الاسلام ابن تيمية سلفي العقيدة اور ابن تیمیہ کی طرف سے دفاع کرنے والے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کے فیض صحبت نے شاہ صاحب کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ بن قیم جہما اللہ کی کتابوں کی طرف متوجہ کیا اور اس طرح انقلاب و تجدید کے ایک امام کا دوسرے امام سے روحانی رابطہ پیدا ہوا۔ شاہ صاحب لئے ان دونوں حضرات سے پورا نفع اٹھایا، بلکہ ان کی طرف سے پوری طرح دفاع بھی فرمایا۔ صاحب جلاء العینین تمہیمات کے حوالہ سے شاہ صاحب سے نقل کرتے ہیں۔

وعلى هذا الاصل اعتقدنا في شيخ الاسلام ابن

تيمية رحمه الله فانا قد تحققنا من حاله انه عالم

بكتاب الله ومعانيه اللغويته والشرعيه وحافظ لسنة

رسول الله صلى الله عليه وسلم وآثار السلف

عارف لمعانيهما اللغويه والشرعية استاذ في النحو واللغة محرو لمذهب الحنابلة فروعه واصوله فائق في الذكاء ولسان وبلاغة في الذب عن عقيدة اهل السنة لم يوتر عنه فسق ولا بدعة اللهم الا هذه الامور التي ضيق عليه لاجلها وليس شئ منها الا دمعه وليله من الكتاب والسنة وآثار السلف فمثل هذا الشيخ عزيز الوجود في العالم ومن يطق ان يلحق شاء وة في تحريره وتقريره والذين ضيقوا عليه ما بلغوا معشار ما اتاه الله تعالى وان كان تضييقه ذالك ناشئاً من اجتهاد، ومشاجرة العلماء في ذالك ما هي الا كمشاجرة الصحابة رضی اللہ عنہم فيما بينهم والواجب في ذالك كف اللسان الابخير!

”اسی اصل پر ہم نے ابن تیمیہ کے بارہ میں اعتقاد کیا ہم نے ان کے حال کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ کتاب و سنت کے عالم اس کے معانی سے واقف اور سنت رسول اللہ کے حافظ ہیں نحو اور لغت کے امام ہیں حنابلہ کے اصول و فروع کے مبلغ ہیں اہل سنت کی طرف سے وفاع کرتے ہیں ان سے کسی قسم کا فسق یا بدعت ہم نے سرزد ہوتے نہیں دیکھا البتہ وہ امور جن کے متعلق ان پر اعتراض کیا گیا ہے تو ان میں سے کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق ان کے پاس کتاب و سنت سے کوئی دلیل نہ ہو ایسا عالم زمانہ میں مشکل سے پیدا ہوتا ہے، کون ہے جو ان کی تحریر و تقریر کا مقابلہ کر سکے؟ جن لوگوں نے ان پر اعتراض کیا ہے ان کو ان کے علم کا دسواں حصہ بھی نہیں ملا ہے، ہاں ان کے بارہ میں علماء کا مشاہدہ ایسا ہی ہے جیسے صحابہ کرام کا آپس میں، ضروری ہے کہ ان کے متعلق خیر کے سوا اپنی زبان بند رکھی جائے۔“

ان الفاظ پر غور کرو شاہ صاحب شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی جلالت علم، فقہ دین اور حمایت اسلام کے جوش و ولولہ سے کیسے متاثر نظر آتے ہیں۔

اونٹ کے گوشت سے بعض وضو کرتے تھے بعض نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے ہر شخص ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتا تھا مثلاً ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام شافعی وغیرہ ائمہ مدینہ مالکیہ وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اگرچہ وہ لوگ سرایا جہرا بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے، رشید نے نماز پڑھائی در انحال یہ کہ اس نے بچھنا لگایا تھا امام ابو یوسف نے اس کے پیچھے نماز پڑھی، لوٹائی نہیں، امام مالک نے فتویٰ دیا تھا کہ ان پر وضو نہیں ہے اور امام احمد کچھنے اور رعا ف کے باعث وضوء کو کہتے تھے ان سے کہا گیا کہ اگر امام کے خون نکلے اور وہ وضوء نہ کرے تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے فرمایا میں امام مالک اور سعید بن المسیب کے پیچھے نماز کیسے نہ پڑھوں گا؟“

یعنی یہی عبارت شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے فتاویٰ جلد دوم ص ۳۸۰ میں پائی جاتی ہے: ملاحظہ ہو

وقد كانت الصحابة والتابعون ومن بعدهم منهم من يقرأ البسمله ومنهم من لا يقرأها ومنهم من يجهر بها ومنهم من لا يجهر بها وكان منهم من يقرأ في الفجر ومنهم من لا يقرأ في الفجر ومنهم من يتوضأ من الحجامة والرعا ف والقي ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومنهم من يتوضأ من مس الذكر ومس النساء بشهوة ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومنهم من يتوضأ من القهقهة في صلواته ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومنهم من يتوضأ عن اكل لحم الابل ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومع هذا فكان بعضهم يصلی خلف بعض مثل ما كان ابو حنیفة واصحابه والشافعی وغيرهم يصلون خلف ائمة اهل المدينة من المالکیة وان كانوا لا یقرؤن البسمله لا سراً ولا جهرأ وصلی ابو یوسف خلف الرشید وقد احتجم وافتاه مالک بانہ لا يتوضأ فصلی خلفه ابو یوسف ولم يعد، وكان

شاہ صاحب کی مصنفات میں جا بجا شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے خیالات ملتے ہیں بعض جگہ تو پوری کی پوری عبارت نقل فرمادی ہے۔ لیکن نام نہیں لیا ہے اس کی وجہ غالباً اہل زمانہ کا تعصب ہے۔ مثال کے طور پر حجۃ اللہ البالغہ مطبوع صدیقی بریلی کی یہ عبارت ملاحظہ ہو (جلد ص ۱۶۴)

وقد كان في الصحابة ومن بعدهم من يقرأ البسمله، ومنهم من لا يقرأها ومنهم من يجهر بها ومنهم من لا يجهر بها وكان منهم من يقرأ في الفجر ومنهم من يتوضأ من الحجامة والرعا ف والقي ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومنهم من يتوضأ من مس الذكر ومس النساء بشهوة ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومنهم من يتوضأ من مامسة النار ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومنهم من يتوضأ من اكل لحم الابل ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومع هذا فكان بعضهم يصلی خلف بعض مثل ما كان ابو حنیفة واصحابه والشافعی وغيرهم رضی اللہ عنہم يصلون خلف ائمة المدينة من المالکیة وغيرهم وان كانوا لا یقرؤن البسمله لا سراً ولا جهرأ، وصلی الرشید اماماً وقد احتجم فصلی الامام ابو یوسف خلفه ولم يعد وكان افتاه الامام مالک بانہ لا وضوء علیه وكان الامام احمد بن حنبل یرى الوضوء من الرعا ف والحجامة قیل له فان كان الامام قد خرج منه الدم ولم يتوضأ هل تصلی خلفه فقال کیف لا اصلی خلف الامام مالک وسعید بن المسیب.

”صحابہ اور ان کے بعد ایسے لوگ تھے کہ بعض بسم اللہ پڑھتے تھے بعض اس کو جہر سے پڑھتے تھے بعض نہیں، ان میں سے بعض فجر میں قنوت پڑھتے تھے بعض نہیں، بعض تی اور رعا ف سے وضو کرتے تھے بعض نہیں، بعض من ذکر اور عورتوں کو شہوت کے ساتھ چھونے سے وضو کرتے تھے بعض نہیں، مامتہ النار اور

(بقیہ شاہ ولی اللہ اور ان کی بعض علمی خصوصیات)

شاہ صاحب اپنی تصنیف البدور البازغہ میں ڈکٹریٹر کو ”امام حق“ سے تعبیر کرتے اور اجتماعی زندگی کا تنہا اس کو ہی ضامن قرار دیتے ہیں۔

تیسرے شاہ صاحب تمام اسلامی طبقات کی اصلاح و تنظیم اور ان کی صنعتی ترقیات کو بھی نہایت اہم چیزوں میں سے شمار کرتے ہیں بلکہ ان کے مکاشفات کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس انقلابی دور کے لئے صنعت و مزدور پیشگی ہی کو ”ملاء اعلیٰ“ کی مرضیات بتاتے ہیں یعنی ہمارے زمانہ میں خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے محنت پیشہ طبقات کی اہمیت کو کم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس زمانہ کے لئے خدا اور اس کے مرکزی قانون کا منشاء یہ ہی ہے۔ افسوس ہے کہ عدیم الفرستی کی بنا پر مذکورہ علمی نکات پر بھی سیر حاصل بحث نہیں کر سکتا کچا یہ کہ شاہ صاحب کی علمی خصوصیات پر کوئی مقالہ علم و تحقیق کے سایہ میں ترتیب دے سکنے کی کوشش کی جائے۔

احمد بن حنبل یری الوضوء من الحجامة والرعاف
فقيل له فان كان الامام قد خرج منه الدم ولم
يتوضأ تصلى خلفه فقال كيف لا اصلى خلف سعيد
بن المسيب ومالك.

اسی طرح دیکھو شاہ صاحب الفوز الکبیر میں سبب نزول کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

آنچه از استقراء کلام صحابہ و تابعین معلوم می شود آن است که ”نزولت فی کذا“ محض برائے قصہ کہ در زمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بودہ و سبب نزول آیت گشتہ استعمال کنند، بلکه گاہے یکے از ما ”صدق علیہ“ آید را کہ در زمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بودہ است یا بعد از آن حضرت ذکر کنند و گویند نزولت فی کذا

صحابہ اور تابعین کے کلام کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ (نزولت فی کذا) محض اس واقعہ کے لئے نہیں ہے جو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوا اور نزول آیت کا سبب بن گیا، بلکہ اس پر بھی بولتے ہیں جس پر یہ آیت صادق آرہی ہو خواہ وہ واقعہ عہد نبوی میں ہو یا بعد کو۔

بالکل اسی مفہوم کو حافظ جلال الدین سیوطی اتقان میں ابن تیمیہ سے نقل کرتے ہیں۔

قال ابن تیمیہ قولہم نزولت ہذا الایتہ فی کذا یراد بہ تارۃ سبب النزول ویراد بہ تارۃ ان ذالک داخل فی ہذہ الایتہ وان لم یکن السبب کما تقول عنی بہذہ الایتہ کذا (النوع التاسع)

ابن تیمیہ نے کہا کہ ان لوگوں کا قول ”نزولت ہذا الایتہ فی کذا“ کبھی اس سے سبب نزول مراد ہوتا ہے اور کبھی اس سے یہ مراد ہوتا ہے کہ یہ بھی اس آیت کے مصداق میں داخل ہے اگرچہ وہ سبب نہ ہو۔

ان تصریحات کے بعد اگر ہم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ شاہ صاحب کے علمی انقلاب میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے خیالات کو کسی حد تک ضرور دخل ہے تو شاید بے جا نہ ہو۔

ضروری اطلاع

ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی صاحب

سابق گورنر ریاستہائے بہار و بنگال

اور ہریانہ اور سابق ممبر پارلیمنٹ کی

”ماہ نامہ براہین اور ان کی طویل

علمی و سماجی اور سیاسی خدمات“

پر

ماہنامہ براہین دہلی

کا خصوصی شمارہ جلد ہی منظر عام پر آ رہا ہے۔

ادارہ

☆☆☆

شاہ ولی اللہ اور ان کی بعض علمی خصوصیات

مولانا سید ابوالنظر رضوی امر وہوی

الہی نے بعض مصالِح کے پیش نظر ترک قوم کو شہنشاہیت سپرد کرنا چاہی تو ان کے دل میں مذہب اسلام اختیار کرنے کی تڑپ پیدا کر دی۔ لیکن قریش کی بزرگی کا سبب ان کے درمیان بہت دنوں تک حکومت کا رہتا ہے۔

والذی اعتقدہ انه ان اتفق غلبۃ الہنود مثلاً علی اقلیم ہندوستان غلبۃ مستقرۃ عامۃ وجب فی حکمۃ اللہ ان یلہم رؤسائہم التمدین بدین الاسلام کما الہم الترمک وذلک منشعب علی عموم نبویۃ وانعقاد کونہ صاحب ملتہ۔

وہ چیز جس پر میرا وجدان گواہی دیتا ہے یہ ہے کہ اگر کسی سیاسی انقلاب کا تقاضا یہ ہوا کہ ہندو ہندوستان یا اس کے ملکات پر بھی حکومت کریں اور حکومت بھی مستقل اور ہمہ گیر قسم کی ہو تو یقیناً خدا کے قانون کا فیصلہ یہی ہوگا کہ ہندو لیڈر اسلام قبول کریں گے جیسے کہ ترکوں نے قبول کر لیا تھا کیونکہ عموم نبوت اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب ملت ہونے کا نتیجہ ہی ہونا چاہئے۔

اس کے معنی جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہوں گے اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ اگر سیاسی انقلاب کوئی ایسی کروٹ لیتا ہے جس میں ہندوستانی ہی ہندوستان پر حکومت کر سکتے ہوں تو مسلمانوں کو اکثریت و اقلیت کی ذہنی کشمکش قبول کرنے سے انکار کر دینا چاہئے ہندوستان یا تو کسی نہ کسی شہنشاہیت کا غلام رہے گا ورنہ جمہوری حکومت قائم ہونے کی صورت میں ہندوستان کی فضاؤں میں اسلامی پرچم ہی لہرا سکتا ہے بالشوایزم۔ نازی ازم یا ہندو ازم کا پرچم نہیں۔

قدرت کے بہترین شاہکار اور مجدد علم و حکمت شاہ ولی اللہ صاحب کی علمی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف مذہبی حقائق ہی کی مکمل تفسیر کی جائے گی بلکہ حیات و مرگ کا ہر عقدہ علم و سیاست کا ہر گوشہ اور تمدن و معاشرت کی ہر پیچیدگی بھی حل کی جائے گی لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تشنگی کو دور کرنے کے لئے ایک مختصر مضمون کافی نہیں ہو سکتا اور بسیط تحقیقی مضمون عام دلچسپیوں کو جذب نہ کر سکے گا اس لئے مجبور ہو کر صرف چند سیاسی نکات کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ امید کہ اسے دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے گا۔

شاہ صاحب اپنی تصنیف تہمیمات الہیہ جلد اول ص ۲۰۳ پر تحریر فرماتے ہیں:-

واعلم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجتمعت فیہ خصلتان احدهما النبوة والثانية سعادة قریش بسببہ فالنبوة عمت کل الاصناف الاحمر والاسود مستویان فیما یرجع الی الفیض الذی ہو من باب النبوة ولذلك لما اقتضت المصلحة الكلية عموم سلطنة الترمک الہم التمدین بدین الاسلام واما سعادة قریش فسببہا کانت خلافتہم الی زمان طویل

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دو قسم کے اخلاقی ملکات تھے ایک نبوت دوسرے قبیلہ قریش کی عظمت و برتری، نبوت ہر رنگ و نسل کے لئے یکساں تھی اپنے عمومی فائدہ کے لحاظ سے یہی وجہ ہے کہ جب حکمت

مسلمانوں کو زمین سے آسمان تک اٹھانے کے قابل ہے، مسلمان اور اخلاقی شعور دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ مگر اقتصادی مجبوریوں نے اس کے ذہن و وجدان کو ماؤف کر دیا اور وہ اس قابل نہ رہا کہ خود اپنی ہستی ہی کو سنبھال سکے کجا یہ کہ دوسری قوموں کو دعوت عمل دے۔ لیکن جب یہ کاٹنا جو اس کی زندگی کے ہر پہلو میں کھٹک رہا ہے نکل جائے گا تو دنیا میں کوئی قوم ہے جو اس کی پاکیزہ اور بلند ترین ذہنیت کا مقابلہ کر سکے گی کاش اسلامی فطرت کے نازک ترین محاسن اور مسلمانوں کی ماحولی کمزوریوں کا احساس ہمارے نوجوانوں کو ہوتا تو وہ کبھی کسی دوسرے نظریہ کے قدموں پر سجدہ کرنا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ مگر مجھے اس کا بھی کچھ خوف نہیں کیونکہ وقت کی وہ آواز جو ابھی دور سے آرہی ہے عنقریب خواب کے نشہ میں چور نوجوانوں کو چپکیاں لے لے کر جگا دے گی اور پھر انھیں کوئی طاقت خواب گراں کی آلودگیوں سے دوبارہ تروا دینا نہ کر سکے گی اور وہ ہی ہماری عید کا پہلا دن اور ہماری تاریخ شام کی تابناک صبح ہوگی۔

(۲) ہم غلامی کی بنیاد پر آج کوئی بین الاقوامی مجاز قائم نہیں کر سکتے مگر جب ہم اس قابل ہو جائیں گے تو ہماری طاقت ناقابل شکست اور ہمارا اقتدار ناقابل انکار حد تک پہنچ جائے گا آپ شاید اس چیز سے پوری طرح واقف ہوں گے کہ ہمارے برادران وطن انفعالی ذہنیت رکھتے ہیں، ہر درخت، ہر دریا اور ہر مار و کٹر دم کے سامنے سجدہ کرنے والی قوم کیا آپ کے نزدیک مسلمانوں کی اخلاقی طاقت سے اثر پذیر ہوئے بغیر رہ سکتی ہے؟ پھر بین الاقوامی اتحاد سے ہمارے برادران وطن کو بین الاقوامیت کا صحیح مفہوم بھی سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی اور ہندوؤں میں بین الاقوامی ذہنیت کا پیدا ہو جانا ہی ہندوستان میں اسلام کی پہلی اور آخری فتح ہوگی۔ چھوت چھات، مذاہب پر محققانہ نگاہ سے گریز صدہا خدا بنا لینے کی بنا پر لامرکزی ذہنیت کا عذاب اور اس کی تاریخ ترین پستی ان کو محسوس ہونے لگے گی اور وہ ہر لمحہ گزرنے پر اسلامی تعلیم، اسلام کی انقلابی تحریک اور اسلام کے ہر ذہنی ارتقا سے وابستہ ہوتے ہوئے آخر اس دعوت حق پیغام الہی اور پائندہ درین حیات سے سبق لینے لگیں گے جسے ہماری اصطلاح میں اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج ایک اشتراکی اپنے نصب العین کی صداقت پر اعتماد رکھنا اور اس ہی نظریہ کو معاشی زندگی کا آخری حل یقین کرتا ہے لیکن بد نصیب مسلمان ہی کو اس چیز پر ذرہ برابر ایمان نہیں کہ اسلام نے جو بہترین نظریہ حیات کائنات انسانی کے لئے اختراع کیا تھا اور جس کے سوا کوئی دوسرا نظریہ فطرت انسانی کی تشنگی نہیں بجا سکتا وہ ہی علمی زندگی کی ہر گتھی کو سلجھا سکتا ہے سیاست و معاشرت کا کوئی پہلو اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اسلام کے ناخن تدبیر سے عقدہ کشائی کا مطالبہ نہ کیا جائے گا اگر ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ اسلام کے قانون حیات کو پوری روشنی میں لے آیا جائے آج ہر نظریہ اپنے قانونی دفعات کی تشریح کر رہا ہے مگر ایک اسلامی قانون ہی ایسا ہے جس کا معاشی، سیاسی اور تمدنی قانون موجود شعوری رجحانات کے سایہ میں دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جاسکتا ورنہ اس کے کوئی معنی نہ تھے کہ ہر ناممکن قانون اپنی تکمیل کا دعویٰ کر رہا ہو لیکن قدرت کا مکمل قانون ہی اپنی تشنگی کے لئے ہر سراپ نظر کا محتاج ہو۔

آج آپ اکثریت کے زعم باطل سے کانپ رہے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان کو آزادی نصیب ہوتے ہی حسب ذیل حقائق سے اسلامی ہند کا دوچار ہونا تو انہیں فطرت کے ناقابل تبدیل فیصلوں میں سے ایک ہے۔

(۱) مسلمان کی وہ دولت اور وہ برتری جس کا نام تجارتی ذہنیت تھا دوبارہ دامن میں آجائے گی اور آپ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ ہی وہ راز تھا جس نے ایک طرف مسلمان کو دنیا کے ہر گوشہ تک پہنچنے پر آمادہ کیا تھا اور دوسری طرف عام انسانی فطرت سے واقف کرتے ہوئے اخلاقی ملکات کے عملی فوائد سے بھی آشنا اور اس ہی بنا پر ہر مسلمان اپنی جگہ پر وسعت نظر کے ساتھ ایک بہترین مبلغ کے فرائض انجام دے سکتا تھا آج یہ دولت ہم سے غصب کر لی گئی ہے مگر جب ہماری وراثت ہمیں واپس مل جائے گی تو ہم ہی اس اسٹیج سے دنیا کو پیغام زندگی دے رہے ہوں گے۔ جہاں سے ہم ہمیشہ جزأت، رواداری، سچائی اور نیک عملیوں کا پیغام دیتے رہے تھے آپ اس نکتہ کو معمولی سمجھتے تھے یہی چیز

تک ہم زندہ رہ سکنے کی صلاحیت، سیاسی طاقت کی تقسیم، باہمی تقسیم سے نہ پیدا کرتے رہیں گے، نتائج ہمارے قابو میں نہیں آسکتے۔ پاکستان کا جہاں تک آئینی نظریات سے تعلق ہے اس کو ایک بہترین لائحہ عمل کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ رہا پاکستانی اسکیم کا عملی نظریہ ہونا نہ ہونا یہ ہر شعوری نظریہ کی طرح ایثار و قربانی کے جذبات اور قوم کے احساس خودداری پر موقوف رہے گا اگر مسلمان مرکزی حکومت میں ناقابل انکار سیاسی اقتدار نہ قائم کر سکیں تو یہ قدرت کا ظلم یا اسکیم کا نقص نہیں بلکہ تغیر انفس کی دعوت قرآنی قبول نہ کرنے کا نتیجہ ہوگا۔

شاید یہ ایک سوال پیدا ہو کہ اگر ہر قوم کا مستقل حکومت تک پہنچ کر مسلمان ہو جانا ضروری ہے تو مغربی اقوام، عیسائیت سے اسلام کی طرف کیوں آج تک رجوع نہ ہو سکیں۔ اسلئے میں اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف اتنا بتادینا چاہتا ہوں کہ قرآن نے ہمیں بتادیا ہے کہ چونکہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ اور ان کے پیغمبروں پر مظالم کئے تھے اسلئے خدا نے اس کا رد عمل عیسائیوں ہی کے ہاتھوں سے ضروری قرار دیتے ہوئے وہ وعدہ کیا کہ عیسائیوں کی حکومت ہمیشہ رہے گی تاکہ اس ظالم قوم کو سکون و اطمینان کی زندگی سے آشنا نہ ہونے دیا جاسکے۔ اور چونکہ بقول شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے جیسا کہ انھوں نے تہمیدات الہیہ میں تصریح کی ہے کہ موجودہ عیسائیوں کے پاس حکومت صرف اسلئے ہے کہ خدا نے عیسائیوں سے حکومت کا وعدہ کیا تھا اور آج باوجود ہزاروں کمزوریوں کے اگر کسی گروہ کو عیسائی کہا جاسکتا ہے تو وہ یہی ہیں بنا بریں اس وعدہ کو پورا کرنے کیلئے اس ہی قوم کا انتخاب کرنا پڑا دوسرے مسلمان چونکہ عدل پرست فطرت پر پیدا کئے گئے تھے اسلئے وہ اس غرض کو پورا کرنے کے واسطے کسی طرح موزوں بھی نہ ہو سکتے تھے۔

شاہ صاحبؒ کا دوسرا سیاسی نظریہ آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کے بارے میں ہے۔ اگرچہ آج تک قرآن کی آیات کو مغربی جمہوریت پر ہی چسپاں کیا جاتا رہا مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی آمریت مغربی آمریت سے ترقی یافتہ تھی یا یوں کہنا چاہئے کہ آمریت اور جمہوریت دونوں کے درمیان ایک بہترین سیاسی حکمہ تھا۔ (بقیہ صفحہ ۶۲ پر)

(۳) آج غلامی نے مسلمانوں کو علمی تحقیقات، اجتہادی نظریات اور انقلابی تحریکات سے جہاں تک بے بہرہ بنا دیا ہے اس کا اندازہ آپ کو اسلامی قلعوں (مذہبی مدارس) اسلامی سوسائٹی بلکہ اسلامی ہند کے ہر گوشہ کی ایفون خوردگی سے ہو سکتا ہے۔ نہ جدید علوم حاصل کرنے کا ذوق ہے، نہ جدید ذہنیت کے سانچے میں قدیم نظریات کو ڈھال سکنے کی تمنا نہ مقلدانہ ذہنیت اجتہادی نظریات کو گوارا کرتی ہے نہ اسلام کے وسیع ترین نظام حیات کے ہر پہلو پر ریسرچ کرنے کا کوئی تصور زندگی کی لہر دوڑاتا ہے لیکن اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو یقیناً کہنے کہ یہ ساری فضا یکسر تبدیل ہو جائے گی۔ ترقی کی امنگ تبلیغ کا ولولہ اور ”خیر امت“ ہونے کا یقین ان تمام کمزوریوں کو دور کر دے گا جن کے لئے آج کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی اور مسلمانوں کا یہی شعوری ارتقاء نہ صرف مسلمانوں کو زندہ تر بنانے میں کامیاب ہوگا بلکہ ہماری ہمسایہ قوم کو بھی مطالعہ اور تنقید کی دعوت دے گا جس کی بنیاد پر وہ ایسی زندگی کی تعمیر کر سکیں گے جسے انقلاب اور تغیر کا کوئی زلزلہ اپنی جگہ سے جنبش نہ دے سکے گا۔

اس ہی نوع کے چند در چند اسباب و علل ہیں جو ہندوستان پر اسلامی حکومت کے پرچم کو لہرانے کے ذمہ دار کہلائے جاسکتے ہیں لیکن اس ہی کے ساتھ یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ سب کچھ مکمل آزادی اور استقلال حکومت کے نتائج ہیں جن کو غلامی کے زمانے میں دہرانے سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ دوسرے آپ کو تاریخ کے مطالعہ نے شاید یہ بھی بتادیا ہوگا کہ ترک پہلے وقفہ ہی میں ایمان نہیں لے آئے تھے انھوں نے بھی مسلمانوں سے زبردست جنگ کی تھی، تاریخی تباہی سے آشنا کیا تھا، علم، دولت اور حکومت غصب کر سکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی، اگر مسلمان ان کا ہر سیاسی اور علمی محاذ پر مقابلہ کر سکنے کی ناقابل ہوتے اور اپنی مستقل زندگی کو قائم نہ رکھ سکتے تو ہرگز ترک قوم رد عمل کے قانون کا کوئی اثر قبول نہ کر سکتی۔ ہمارا یہ فرض ناقابل فراموش ہے کہ ہم تنازع اللقوۃ کی جنگ میں کامیاب ہو سکنے کی طاقت اور زندہ رہ سکنے کی صلاحیت کا ثبوت دیتے رہیں ورنہ یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ ترکستان میں ہوا وہ ہی ہندوستان میں بھی ہو۔ قدرت کا ہر کرشمہ گونا گوں استعدادات سے وابستہ ہے جب

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے
 ”عربی، فارسی اور اردو زبان کے فروغ میں

امام شاہ ولی اللہ کا حصہ“

کے موضوع سے روزہ بین الاقوامی سیمینار

بتاریخ ۲۸/۲۹/۳۰ اپریل ۲۰۱۱ء

بمقام آئی سی سی آر، آزاد بھون، آئی ٹی او، نئی دہلی

کے انعقاد پر

اظہار مسرت اور نیک خواہشات

الطاف الرحمن صاحب

ہوسٹن امریکہ

اسلام براعظم پاک و ہند میں حضرت شاہ ولی اللہ کے حوالے سے

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دن کے شہسوار (۳) ہوتے تھے اور ایک ہی انسان کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا اور دوسرے میں تلوار۔

بعد ازاں جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر تو اسلام کے انوار و برکات کا ترشح عرب تاجروں کی آمد و رفت کے طفیل تقریباً مسلسل ہوتا رہا، اگرچہ اس کی نوعیت ایک ہلکی سی پھوار یا دھیمی سی آنچ کی تھی جس کے اثرات زیادہ محسوس و مشہور نہیں ہوتے۔ لیکن شمال مغربی سرحد پر واقع پہاڑی دروں سے اسلام کا سیلاب کم و بیش تین صدیوں بعد شروع ہوا اور مزید لگ بھگ دو سو برس تک اس کی نوعیت واقعتاً پہاڑی ندی نالوں کے سیلاب ہی کی سی رہی کہ زور و شور اور غیظ و غضب کے ساتھ آیا اور آنا فنا گزر گیا۔ اور اگرچہ اس بار موجودہ پاکستان کے نصف شمالی کی قسمت جاگی کہ وہ ۱۰۰۰ء کے آس پاس ہی باقاعدہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا، تاہم واقعہ یہی ہے کہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کی اصل حیثیت پہاڑی نالوں کے سیلاب سے زیادہ نہ تھی جو ادھر آتا ہے ادھر گزر جاتا ہے۔

تختِ دہلی پر مسلمانوں کو باقاعدہ تمکین ۱۲۰۶ء کے لگ بھگ حاصل ہوا اور ہندوستان میں مسلمانوں کا دور حکومت عروج و زوال اور مد و جزر کے مختلف مدارج و مراحل سے گزرتا ہوا ۱۸۵۷ء کے غدر پر ختم ہو گیا۔ ان ساڑھے چھ سو سالوں کے نصف اول کے دوران یعنی ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک پہلے کچھ ترکی النسل غلام بادشاہ (۴) تختِ دہلی کو زینت بخشے رہے اور بعد ازاں کچھ افغان خاندان (ظہبی، لودھی وغیرہ) حکمران رہے اور نصف ثانی یعنی ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک مغلوں کا دور ہے جس کے کل سوا

براعظم پاک و ہند میں خورشید الاسلام اولاً عینِ غرب یعنی مکران اور بلوچستان کے افق پر خلافتِ بنی امیہ کے زمانے میں اس وقت طلوع ہوا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر اسی برس (۱) بیت ہو چکے تھے اور دورِ خلافتِ راشدہ کو ختم ہوئے بھی نصف صدی کے لگ بھگ عرصہ گزر چکا تھا۔ اور اسلام کے صدر اول کا جوش و خروش کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم کے حکم میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ سرزمینِ ہند پر بابِ الاسلامِ سندھ کے راستے اسلام کا یہ ورود و اول بھی کسی مثبت تبلیغی جذبے یا احساسِ فرض کا مرہونِ منت نہ تھا بلکہ ایک وقتی اور فوری اشتعال کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اسلام کی کرنیں موجودہ پاکستان کے بھی صرف نصف جنوبی کو منور کر کے رہ گئیں اور اس مد میں بھی جزر کے آثار فوراً ہی شروع ہو گئے اور برعظیم پاک و ہند میں اسلام کی یہ آمد اولین نہایت محدود بھی رہی اور درجہ عارضی بھی۔

گویا سرزمینِ ہند دورِ نبویؐ اور عہدِ خلافتِ علیؑ منہاج النبوۃ کی برکات سے تو مطلقاً محروم ہی رہی، جس میں ایمان اور یقین کا کیف و سرور اور جہاد و قتال کا جوش و خروش باہم شیر و شکر تھے اور جہاد کی اصل غرض و غایت فریضہ شہادتِ علیؑ کی ادائیگی کا جذبہ تھا یا حصول مرتبہ شہادت (۲) کا ذوق و شوق، نہ کہ ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس یا مالِ غنیمت و اسبابِ عیش کی حرص۔ مزید محرومی یہ رہی کہ اسے اس خالص عربی الاصل اسلام کے اثرات سے متمتع ہونے کا موقع بھی بہت ہی کم ملا جس میں دین و دنیا کی وحدت و یگانگت ابھی اس حد تک باقی تھی کہ رات کے راہب ہی

آیات قرآنی (لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبُّنِيُّونَ وَالْأَخْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِنَّمِ
وَآكِلِهِمُ السُّحْتِ) (المائدہ: ۶۳) اور (إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَخْبَارِ
وَالرُّهْبَانِ لَيَا كُلُّونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ) (التوبہ: ۳۴) کی مظہر
اتم بن چکی تھی۔ فوا حسرتا ویاسفنا!

ہندوستان میں اسلام وارد تو ایسی منقسم حالت میں ہوا تھا کہ اصحاب
سیف و سناں جدا تھے اور صاحبانِ قرطاب و قلم جدا۔ اور زیب منبر و محراب
اور تھے اور زینت میدان جنگ و قتال اور۔ چنانچہ ابتدا میں ایک جانب
محمود غزنوی اور محمد غوری کی سرفروشانہ ترکتازیاں تھیں اور دوسری جانب شیخ
اسماعیل بخاری اور شیخ علی بجوری رحمہما اللہ کی تبلیغ و تلقین اور تعلیم و تربیت کی
انتھک کوششیں۔ اور بعد میں ایک طرف قطب الدین ایک اور بختیار خلجی
کی تلواریں مملکت کی توسیع اور استحکام کا فریضہ سرانجام دے رہی تھیں تو
دوسری طرف خواجگان سلسلہ چشت رحمہم اللہ نفوس کے تزکے، قلوب کے
تصفیے اور سیرت و کردار کی تعمیر میں مصروف تھے۔ تاہم غنیمت ہے کہ آغاز
میں ان دونوں حلقوں کے مابین گہرا ربط و تعلق موجود تھا، جس کا عظیم ترین
نشان (symbol) ہے سلطان التتمش کی جامع الصفات شخصیت کہ
ایک طرف ایک عظیم مملکت کا حکمران بھی تھا اور دوسری طرف خواجہ قطب
الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا حلقہ بگوش اور حد درجہ عابد و زاہد انسان
بھی۔ یہاں تک کہ حضرت خواجہ کے انتقال پر جب لوگ نماز جنازہ کے
لئے جمع ہوئے اور وہاں خواجہ مرحوم کی اس وصیت کا اعلان کیا گیا کہ میری
نماز جنازہ صرف وہ شخص پڑھائے جس نے عمر بھر کبھی زنا نہ کیا ہو اور جس
کی نہ کبھی تکبیر اولیٰ فوت ہوئی ہو نہ عصر کی سنتیں چھوٹی ہوں، نتیجتاً مجمع پر
سکتہ ساطاری ہو گیا اور تمام لوگ حیران و پریشان ہو کر رہ گئے کہ ایسا شخص
کون ہو سکتا ہے جس میں یہ ساری شرطیں پوری موجود ہوں تو قدرے تامل
و انتظار کے بعد جو شخص اگلی صف میں امام کے لئے نکلا وہ خود بادشاہ وقت
سلطان التتمش تھا۔

لیکن جلد ہی یہ رابطہ کمزور پڑ گیا اور رجال سلطنت اور رجال دین
کے مابین ایک بعد اور فصل پیدا ہو گیا اور ان کی شب و روز ایک دوسرے
سے مختلف ہی نہیں بالکل متضاد ہو گئے اور جیسے جیسے وقت گزرا یہ خلیج عمیق

تین سو سالوں میں سے پہلے پونے دو سو برس (۵) ان کی اصل عظمت
وسطوت کا زمانہ ہے اور بعد کے ڈیڑھ سو سال برس اصلاً ایک عظیم عمارت
کے کھنڈروں میں تبدیل ہونے اور بالآخر زمین بوس ہو جانے کا عرصہ! (ع)
”کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی“

گویا ہندوستان میں اسلام آیا ہی اس وقت جب وہ اپنی نشاۃ اولیٰ
کے بعد زوالِ اوّل سے پوری شدت کے ساتھ دو چار ہو چکا تھا اور اس کی
وحدت فکری بھی پارہ پارہ ہو چکی تھی اور وحدت ملی بھی۔ چنانچہ ایک طرف
عالم اسلام کے قلب میں عرب قوت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا اور خلافت بنی
عباس کا دیباچہ سحری کے مانند ٹٹھا رہا تھا (۶) اور پوری مملکت طوائف
الملوک کا شکار تھی، گویا بنی اسمعیل کے حق میں وعید خداوندی (إِنَّ تَتَسَوَّلُوا
يَسْتَبْدِلُ قَوْمًا غَيْرَكُمْ) پوری طرح ظاہر ہو چکی تھی۔ اور دوسری طرف
خلافت اسلامی کی وہ توحیدی شان ایک داستان پارینہ بن چکی تھی جس
میں نہ دین و دنیا کے مابین کوئی دوری تھی نہ مذہب و ریاست میں کوئی
جدائی اور خدا کے جلال و جمال (۷) کے مظاہر جدا تھے نہ سلطانی و درویشی
کے مصداق مختلف! اور اس کی جگہ قیادت و سیادت اور رہنمائی و پیشوائی
کے ضمن میں ملوک، احبار اور رہبان پر مشتمل وہ قدیم تثلیث (۸) پوری
طرح رائج و نافذ ہو چکی تھی جو ایک اسلام کے سواد دنیا کی تمام تہذیبوں اور
تمدنوں کا جزو لاینفک رہی ہے اور جس سے پیشگی خبردار کیا تھی عہدِ اولین
ہی میں حضرت عبداللہ بن المبارک نے اپنے اس حد درجہ فصیح و بلیغ شعر
میں (۹)

وَمَا أَفْسَدَ الدِّينُ إِلَّا الْمُلُوكُ

وَأَخْبَارُ سُوءٍ وَرُهْبَانُهَا

اور اگرچہ اسلام کے اعجاز نے اس دور زوال و انحطاط میں بھی بہت
سی عظیم اور استثنائی (exceptional) شخصیتیں پیدا کیں، جیسے صلاح
الدین ایوبی اور ناصر الدین محمود ایسے درویش بادشاہ اور امام ابن تیمیہ ایسی
جامع سیف و قلم شخصیت تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دور تک ایک جانب
مسلمان حکمران و مسلمان اکثر و بیشتر آئیے ”ان الملوک“ (۱۰) کے مصداق
کامل بن چکے تھے اور دوسری جانب علماء و صوفیاء کی عظیم اکثریت بھی

سے عمیق تر اور وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

ابو حنیفہ می خواہند۔“

(سیر العارفین)

”سبحان اللہ! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے ہوتے

ہوئے مجھ سے امام ابوحنیفہؒ کے قول کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔“

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی ہند میں آغاز ہی سے دو حکومتیں

قائم ہو گئی تھیں، ایک ظاہری حکومت جس کا اقتدار یا زمین پر قائم تھا یا

انسانوں کے جسموں پر۔ اور دوسری باطنی حکومت جس کا سکہ قلوب کی دنیا

میں رواں تھا۔ پہلی حکومت اصلاً ملوک و سلاطین اور امراء و عمائد سلطنت کی

تھی اور ان کے ساتھ بطور تہمت یا ضمیمہ منسلک تھے ائمہ و خطباء مدرسین

و معلمین اور مفتی و قاضی حضرات، اور اس دنیا میں جیسے کہ عرض کیا گیا فقہ ہی

کو گویا کل دین کی حیثیت حاصل تھی! جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تشددانہ

ظاہر پرستی اور قانونی مویشگافی کا دور دورہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ دین و مذہب

نے بالکل خشک قانونیت کی شکل اختیار کر لی۔

دوسری طرف، تصوف کے خاندانوں میں سے ارض ہند پر سب

سے پہلے چشتی سلسلے نے قدم بجائے اور کم و بیش دو صدیوں تک خواجگان

چشت ہی کا طوطی بولتا رہا۔ جیسے ہی اس سلسلے میں قدرے ضعف کے آثار

پیدا ہوئے وسطی اور جنوبی ہند میں سہروردیہ اور شطاریہ سلسلوں کو فروغ

حاصل ہوا اور شمال مغرب میں خصوصاً موجودہ پاکستان کے وسطی علاقوں

میں قادریہ سلسلے نے عروج پایا۔ ان تمام سلسلے میں وحدت الوجود کو گویا

اصول موضوع کی حیثیت حاصل تھی اور اس کے زیر اثر کیف و سرور جذب

و مستی اور وجد و رقص کا ذوق و شوق بڑھ رہا تھا اور فنا فی اللہ کو شغل و سلوک

کے منہائے مقصود کی حیثیت حاصل ہو رہی تھی جس کے باعث قوی مضمحل

ہو رہے تھے اور جذبہ جہاد تو دور رہا جذبہ عمل بھی سرد پڑتا جا رہا تھا۔

مزید برآں۔ باطنی احوال و کوائف پر توجہ کے ارتکاز کے باعث

ظاہر کی اہمیت کم ہوتی جا رہی تھی، طریقت کے عروج کے ساتھ ساتھ

شریعت کا استخفاف ہونے لگا تھا، عشق و محبت کی سرمستی میں پابندی

شریعت اور اتباع سنت پر پھبتیاں کسی جانے لگی تھیں اور ستم بالائے ستم یہ

کہ ہمہ اوستی نظریات کے باعث وسیع المشربی اتنی بڑھتی جا رہی تھی کہ رام

مزید برآں، ہندوستان میں اسلام علاقہ ماوراء النہر سے آیا تھا جہاں

خود مذہبی حلقوں سے مدرسہ و خانقاہ کی تقسیم رائج ہو چکی تھی اور ان کے

مابین مسابقت ہی نہیں منافرت کا آغاز ہو چکا تھا اور جہاں مدارس میں حنفی

فقہ، اشعری و ماتریدی عقائد، یونانی فلسفہ و منطق اور ان سب کے مجموع

مرکب علم کلام کا دور دورہ تھا اور خانقاہوں میں وحدت الوجود کا سکہ رواں

تھا۔ لہذا اسلامی ہند میں مذہب کی عمارت ان ہی دوستونوں پر استوار ہوئی

یعنی ایک شدید حنفیت اور دوسرے وجودی تصوف۔

قرآن حکیم یہاں ابتدا ہی سے صرف ایک ’کتاب مقدس‘ کی

حیثیت سے متعارف ہوا اور علم حدیث سے یہ سرزمین دیر تک نابلد محض

رہی، اور چونکہ عربی یہاں صرف اعلیٰ علمی حلقوں تک محدود رہی اور عام

بول چال، تصنیف و تالیف، شعر و ادب اور سرکاری دربار سب پر فارسی کا

قبضہ رہا لہذا قرآن و حدیث سے یہ بعد اور دوری نہ صرف یہ کہ قائم رہی

بلکہ مروور ایام کے ساتھ مزید بڑھتی چلی گئی۔

اس غلو فی الحنفیت اور بعد عن حدیث الرسول کے ضمن میں ایک

نہایت دلچسپ لیکن ساتھ ہی حد درجہ عبرت انگیز واقعہ نقل ہوا ہے کہ جب

سلطان غیاث الدین تغلق کے دربار میں ایک خاص مسئلے پر شیخ الوقت

خواجہ نظام الدین اولیاء اور شیخ الاسلام قاضی جلال الدین کے مابین

مناظرہ ہوا اور اپنے موقف کے حق میں بطور دلیل پیش کرنا چاہا خواجہ نظام

الدین ایک حدیث رسول گو تو بلا کسی جھجک اور تامل بھرے دربار میں ڈنکے

کی چوٹ پر شیخ الاسلام نے کہا:

”تو مقلد ابو حنیفہ ہستی، ترا با حدیث رسول چہ

کار؟ قول ابو حنیفہ بیارا“

”تم مقلد ابوحنیفہ ہو، یعنی حنفی ہو، تمہیں حدیث رسول سے کیا

رہوکار؟ اگر امام ابوحنیفہ کا کوئی قول پیش کر سکتے ہو تو کرو۔“

جس پر حضرت خواجہ نے یہ کہتے ہوئے مناظرہ ختم کر دیا اور دربار

سے اٹھ گئے کہ:

”سبحان اللہ کہ باوجود قول مصطفویٰ از من قول

آثار جنم لیتے ہیں، ہندوستان میں اسلام کے زوال کی انتہا کا یہ دور سر زمین پاک و ہند میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تمہید بن گیا! بقول علامہ اقبال خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری

سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے لگ بھگ جب مغل اعظم علیہما علیہ کے آفتاب اقتدار نے ابتدائی موانع و مشکلات کی بدلیوں سے نکل کر پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنا شروع ہی کیا تھا اور ہندوستان میں اسلام کے انتہائی زوال و انحطاط کے دور سیاہ کا آغاز ہونے ہی والا تھا، اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے تحت سرزمین ہند میں دو خورشید ہدایت بھی طلوع ہوئے۔ ایک مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (جن کی ولادت ۴۶۵۱ھ میں ہوئی) اور دوسرے حضرت شیخ عبدالحق محمد دہلویؒ (جن کا سن ولادت ۱۵۵۱ء ہے) جن کی مصلحانہ مجددانہ مساعی نے حالات کے دھارے کا رخ اس حد تک موڑ کر رکھ دیا کہ تقریباً چار سو سال کے بعد اسلامی ہند کو غازی اور نگزیب عالمگیرؒ کی ذات میں گویا غازی صلاح الدین ایوبیؒ اور سلطان ناصر الدین محمودؒ کے محاسن کا جامع حکمران نصیب ہوا اور اس طرح مسلم انڈیا کے اڈل و آخر کے مابین ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہو گئی۔

ان میں سے مقدم الذکر یعنی شیخ مجدد کی مساعی میں پر جوش مجددانہ رنگ نمایاں تھا اور موخر الذکر یعنی شیخ محدث کی کوششوں پر خاموش مصلحانہ انداز غالب تھا۔ چنانچہ حالات کے رخ کی فوری تبدیلی میں اصل دخل یقیناً حضرت مجدد کی مساعی کو حاصل ہے جب کہ سرزمین ہند میں علم حدیث نبویؐ کا پودا لگانے کی جو خدمت حضرت محدث نے سرانجام دی اس کے اثرات بہت دیر پا اور دور رس ثابت ہوئے۔

حضرت مجددؒ کی تجدیدی مساعی کا اصل رخ تصحیح عقائد، رد بدعات، التزام شریعت اور اتباع سنت کی جانب تھا۔ اور اس ضمن میں انھوں نے رائج الوقت علمی و نظری اور اخلاقی و عملی ہر نوع کی گراہیوں اور ضلالتوں پر بھرپور تنقید کی۔ چنانچہ تردید شیعیت پر بھی نہ صرف یہ کہ ان کے مکاتیب میں بہت زور ہے بلکہ ”رد و انفض“ کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ بھی انھوں نے تحریر فرمایا۔ اور اگرچہ ان کی ان اساسی کوششوں سے بھی

اور حزن ایک نظر آنے لگے تھے، مسجد و مندر اور دیرو کلیسا میں کوئی فرق نہ رہا تھا اور ع ”با مسلمان اللہ اللہ بارہمن رام رام“ پر عمل عام ہو گیا تھا۔ نتیجتاً ملت اسلامی کا جداگانہ تشخیص ہی شدید خطرات سے دوچار ہو گیا تھا۔

علمائے ظاہر یا ”حاملان دین اور حامیان شرع متین“ کی جانب سے اس طرز عمل کی مخالفت ایک فطری امر تھا، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسہ و خانقاہ کی باہمی چشمک رفتہ رفتہ بغض اور عداوت میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ رجال سلطنت اور رجال دین کی باہمی کشمکش اور علماء اور صوفیاء کی باہمی آویزش کی مسلسل داستان ہے، جس میں ایک بعد ریح (fourth-dimension) کا اضافہ ہو گیا اور اہل عہد مغلیہ میں ایران سے شیعیت کی درآمد سے جس نے گویا جلتی پرتیل کا کام کیا اور اس کے زیر اثر مشرکانہ عقائد و خیالات اور بدعات و رسومات کا ایک سیلاب ارض ہند پر آ گیا!

مسلم انڈیا کا سنہرا دور بلاشبہ اس کا صدر اول ہی تھا، یعنی دور خاندان غلاماں، جس میں ملوک، اہبار، رہبان کی تثلیث اگرچہ اصولاً تو موجود تھی تاہم ابھی اس میں نہ تنزل و انحطاط کے آثار نمایاں ہوئے تھے نہ باہمی بغض و عناد کے، بلکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے نہ صرف یہ کہ باہمی توافق و تعاون موجود تھا بلکہ بعض مثالیں انتہائی حسین امتزاج کی بھی نظر آ جاتی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرا، زوال اور پستی کی جانب قدم بڑھتے گئے اور نہ صرف یہ کہ متذکرہ بالا تثلیث کا گھناؤنا پین بڑھتا چلا گیا، بلکہ اس کی جڑیں بھی مسلم سوسائٹی میں مزید گہری اترتی چلی گئیں۔ تا آنکہ مغل اعظم شہنشاہ اکبر کے زمانے میں یہ صورت حال اپنے نقطہ عروج (climax) کو پہنچ گئی اور حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ عین اس وقت

جب کہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا خورشید حکومت نصف النہار پر چمک رہا تھا، اسلام پر انتہائی غربت اور شدید بے کسی و کمپرسی کی حالت طاری ہو گئی! یہاں تک کہ نام نہاد، دین الہی، نے دین محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی کامل بیخ کنی کرنے یا کم از کم اسے سرزمین ہند سے ملک بدر کر دینے کا بیڑا اٹھایا، یہ دوسری بات ہے کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق کہ جہز جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اسی کی کوکھ سے مد کے

’طریقت‘ اور ’شریعت‘ کے بعد کو کم کرنے اور اس بڑھتی ہوئی خلیج کے پانے میں بہت مدد ملی تاہم اس میدان میں ان کا اصل کارنامہ فلسفہ وحدت الوجود کے مقابلے میں نظریہ وحدت الشہود کی تدوین و ترویج ہے، جس نے ان تمام مفاسد کا سدباب کر دیا جو تصوف کی راہ سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ نتیجتاً باطن کے ساتھ ساتھ ظاہر کی اہمیت بھی دوبارہ مسلم ہوئی، عشق و محبت کے ساتھ ساتھ اطاعت و اتباع کا جذبہ بھی از سر نو بیدار ہوا، فنا فی اللہ کے بجائے بقا باللہ کو مقصود و مطلوب کا درجہ حاصل ہوا، جذب و سکر اور مستی و بے خودی کے بجائے جذبہ عمل اور جوش جہاد نمایاں ہوئے اور ان سب کا حاصل یہ کہ ہند میں ملت اسلامیہ کا جداگانہ تشخیص از سر نو مستحکم ہو گیا۔ اور یہ خطرہ ٹل گیا کہ کہیں سرزمین ہند میں جسے مذہبوں اور فلسفوں کے بہت بڑے عجائب گھر کی حیثیت حاصل ہے دین محمدی بھی صرف ماضی کی ایک یادگار بن کر نہ رہ جائے بقول علامہ اقبال مرحوماً

حاضر ہوا میں شیخ مجددؒ کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار
وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خیردار!

سلسلہ نقشبندیہ، جس کا پودا سرزمین ہند میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مرشد خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ سے لگا، اصلاً بھی جملہ سلاسل طریقت میں سے اقرب الشریعت ہے اور حضرت مجددؒ کے ہاتھوں جو عظیم الشان کارنامہ سرانجام پایا اس کی بنیاد بھی خواجہ باقی باللہ کے ہاتھوں پڑ چکی تھی، تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس میں جو شان حضرت مجددؒ نے پیدا کی وہ انہی کا حصہ ہے۔ اور یوں تو بعد میں سلسلہ نقشبندیہ باقیوہ بھی ہندوستان میں جاری رہا اور اس سے بہت سا خیر پھیلا، لیکن ”ہند میں سرمایہ ملت کی نگہبانی“ کا فریضہ جس شان کے ساتھ حضرت مجددؒ کے اہفاد و خلفاء نے ادا کیا اس میں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ یہی وہ واحد سلسلہ ہے جس کے منسلکین نے ذکر و شغل اور

مجاہدہ و ریاضت کے علاوہ کلمہ حق کہنے کی پاداش میں رد بدعت و رخص کے جرم کی سزا کے طور پر حوالہ زنداں ہونے اور جان پر کھیل جانے کی روایات کو بھی از سر نو تازہ کیا۔ گویا ”من از سر نو جلوہ دہم دار و رس را!“ (سرمد) بایں ہمہ، حضرت مجددؒ کے یہاں بھی حقیقت میں غلو اسی شدت کے ساتھ موجود ہے جو مسلم انڈیا کی پوری تاریخ کا جزو ولایت نک ہے۔ گویا حضرت مجددؒ کی مساعی سے اسلام ہند میں اس مقام تک تو پہنچ گیا جہاں سے (دور غلاماں میں) اس کا آغاز ہوا تھا لیکن ”دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو“ کا عمل اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

البتہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی خدمات کو اس سمت میں ایک مزید قدم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ شیخ محدثؒ کی شخصیت بعض پہلوؤں سے تو حضرت مجددؒ ہی کی شخصیت کا ظل معلوم ہوتی ہے، لیکن بعض دوسرے اعتبارات سے ان کی حیثیت تقریباً ایک ڈیڑھ صدی بعد طلوع ہونے والے آفتاب رشد و ہدایت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پیش رو یا مقدمۃ الحیش کی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ صوفی بھی تھے اور خواجہ باقی باللہؒ ہی کے مرید بھی، لیکن اس کے باوجود کہ انہیں بھی وحدت الوجود سے بعد تھا وہ اس کی تردید میں اس درجہ سرگرم نظر نہیں آتے۔ اسی طرح وہ حنفی بھی تھے لیکن تشدد نہیں بلکہ فقہ حنفی کا رشتہ حدیث رسولؐ کے ساتھ جوڑنے کی سعی اولاً انہی سے شروع ہوئی۔ ان دونوں پہلوؤں سے تو وہ شیخ مجددؒ اور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بین بین نظر آتے ہیں، لیکن اس اعتبار سے کہ امام الہندؒ نے اسلام کا رشتہ اس کی اصل ثابت، یعنی قرآن حکیم کے ساتھ از سر نو قائم کرنے کی کوشش کا آغاز کیا اور شیخ محدث نے دین کا تعلق اس اصل ثابت، کی ’فرع اول‘ کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی، ان کی شخصیت حضرت امام الہندؒ کی شخصیت کا مقدمہ یا دینا چہ نظر آتی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہی حضرت محدث کی اصل خدمت (contribution) ہے کہ انہوں نے علم حدیث کا پودا سرزمین ہند میں لگایا اور حدیث رسولؐ کی باقاعدہ درس و تدریس کا بھی آغاز کیا اور اس سے متعلق تصنیف و تالیف کا بھی! چنانچہ خود انہوں نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا اور ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام نورالحق نے صحیح

کی حیثیت حاصل ہے۔

ان پر مستزاد ہیں شاہ صاحبؒ کے وہ کارنامے جن کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے طویل عمل کا اصل نقطہ آغاز ان ہی کی ذات گرامی ہے۔

مثلاً ایک یہ کہ علم فقہ کے میدان میں ایک طرف آپ نے ”عقد الحجد فی احکام الاجتہاد والتقلید“ تصنیف فرمائی جس سے تقلید جامع اور اجتہاد مطلق کے مابین اعتدال کی راہ واضح ہوئی اور دوسری طرف ”الانصاف فی بیان سبب الاختلاف“ ایسی معرکہ الآراء کتاب لکھی جس نے فقہی اختلافات کی اہمیت کو کم کرنے کے ضمن میں نہایت دور رس نتائج پیدا کئے۔

دوسرے یہ کہ اپنی مشہور زمانہ تصنیف ”حجۃ اللہ البالغہ“ کے ذریعے آپ نے حکمت دین کو ایک باقاعدہ علم کی حیثیت دے دی اور اسلام کے نظام عقائد، نظام عبادات اور نظام معاشرت و معاملات کو ایک مربوط اور منضبط نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جس کی آنے والے دور میں شدید ترین ضرورت پیش آنے والی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اسلام کا رشتہ اس کی اصل ثابت یعنی قرآن حکیم کے ساتھ از سر نو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا۔ چنانچہ ایک طرف قرآن مجید کے فارسی ترجمے کے ذریعے قرآن کے مطالب و مفہیم کو عوام تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اگرچہ اس پر انہیں شدید مخالفت حتیٰ کہ عوامی یورش تک کا سامنا کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف ”الغور الکیبر فی اصول التفسیر“ کی تصنیف کے ذریعے علم تفسیر کو ایک چیتاں کے بجائے ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے متعارف کرایا اور درمیانی استعداد تک کے حامل لوگوں کے لئے فہم قرآن کی راہیں آسان کر دیں۔

شاہ صاحبؒ کے جلیل القدر فرزندوں میں سے دو یعنی شیخ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن مجید کے با محاورہ اور لفظی ترجمے کر کے گویا اپنے والد مرحوم کے شروع کئے ہوئے کام کو منطقی انتہا تک پہنچا دیا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج بر عظیم ہندوپاک میں علم فہم قرآن کا جو غلغلہ اور ہمہ ہے وہ سب دہلی کے اسی عظیم خانوادے کی مساعی کا نتیجہ نہیں۔

بخاری کو فارسی میں منتقل کیا۔ مزید برآں انھوں نے مشکوٰۃ کی ایک مفصل شرح (لمعات النسخ) عربی زبان میں اور اس سے بھی زیادہ طویل شرح (اشحۃ للمعات) فارسی میں تحریر کی، علاوہ ازیں اسناد حدیث اور اسماء الرجال پر بھی ایک کتاب تصنیف کی اور ”لمعات“ کے مقدمے کے ذریعے بھی علوم حدیث کا ایک جامع تعارف کرا دیا۔

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تجدیدی مساعی کا تفصیلی جائزہ تو ظاہر ہے کہ ان مختصر شذرات کی حدود سے باہر ہے، تاہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دور صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں ان کی سی جامعیت کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعتاً دور جدید کے فاتح ہیں اور اس اعتبار سے خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ انھوں نے حضرت مجدد اور شیخ محدث دونوں کی مساعی کو منطقی انتہا تک پہنچایا خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ وہ دونوں اصلاً امام الہند ہی کی شخصیت کی تمہید تھے، کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک طرف حضرت مجدد نے ہند میں امت مسلمہ کو از سر نو ایک مستحکم داخلی شخص عطا کیا تو شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دے کر امت کے خلاف اٹھنے والے سب سے بڑے خارجی طوفان کے مقابلے کا سامان کیا۔ حضرت مجدد نے ”رد و انقض“ سے جس کام کا آغاز فرمایا تھا اس کی تکمیل شاہ صاحبؒ نے ”ازالۃ الخفاء عن خلافة الخلفاء“ اور ”قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین“ اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے ”تحفۃ اثنا عشریہ“ ایسی کتابوں کی تصنیف سے کی۔ دوسری طرف شیخ محدثؒ نے علم حدیث کا جو پودا سر زمین ہند میں لگایا تھا شاہ صاحب اور ان کے خلفاء نے نہ صرف یہ کہ اس کی آبیاری کی بلکہ اپنی انتھک کوششوں سے صنم خانہ ہند کو علم حدیث نبویؐ کا ایک عظیم الشان چمن بنا دیا۔ عجیب مشابہت ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی اور ایک فارسی میں۔ اسی طرح امام الہندؒ نے مؤطا امام مالکؒ کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی (المسوی) اور ایک فارسی میں لکھی (المصفی) واضح رہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک مؤطا امام مالکؒ کو علم حدیث کے ذیل میں اصل اول

الغرض ویسے تو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا علمی اصلاح و تجدید کا پورا کارنامہ ہی نہایت رفیع اور قابل قدر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی مساعی کو عالم اسلام میں یورپ کی پوری تحریک احیاء العلوم (Renaissance) کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے لیکن ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے توجہات کو از سر نو قرآن حکیم کے علم و حکمت کی جانب منعطف کر دیا اور اللہ کی رسی کے ساتھ امت مسلمہ کے تعلق کو دوبارہ استوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اس قول کے مطابق کہ ”لا یصلح اخر هذه الامة الا بما صلح بنہ اولہا“ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی سعی و جہد کی راہ کھول دی۔

فجزاه اللہ احسن الجزاء

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی قرآنی خدمات پر جو جامع تبصرہ شیخ محمد اکرام مرحوم نے اپنی تالیف ”رود کوثر“ میں کیا ہے وہ ہدیہ قارئین کر دیا جائے۔ وھو ہذا:

”آپ کا سب سے اہم کام قرآن اور علوم قرآنی کی اشاعت ہے اور اس سلسلے میں آپ کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی، لیکن اس زبان میں قرآن مجید کا کوئی ترجمہ رائج نہ تھا (۱۱)۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان، بوستان، سکندر نامہ اور شاہنامہ تو پڑھتے اور سمجھتے، لیکن قرآن مجید سے جو ہدایات کا سرچشمہ ہے، ناواقف رہتے۔ پرانے علماء اور خواص میں سے قرآن مجید اگر کسی نے پڑھا تو ناظرانہ یعنی مفہوم و معانی سمجھنے اور اس کی روح و تعلیمات سے فیضیاب ہونے کے بغیر۔ اکبر کے دربار میں جب مسلمان علماء اور پرتگیزی مشنریوں میں مباحثے ہوئے اور مشنریوں نے (جو کلام مجید کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے اندراجات سے خوب واقف تھے) کلام مجید کے بعض حصوں پر اعتراض کئے تو ان وقت پتا چلا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا

بھی تھا انہیں بھی اس کے مضامین اور اندراجات سے پوری طرح واقفیت نہ تھی۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ پادری کلام مجید کے کسی بیان پر اعتراض کرتے اور مسلمان کہہ دیتے کہ یہ تو قرآن میں ہے ہی نہیں اور پھر جب کلام مجید کھول کے دیکھا جاتا تو وہ حوالے نکلتے۔ شاہ صاحب کو اس بوالعجبی کا احساس ہوا اور حج سے واپس آنے کے پانچ سال بعد ۸۳-۷۳۱ء میں آپ نے فارسی زبان میں کلام مجید کا ترجمہ کیا۔ جب علماء کو اس کا پتا چلا تو تلواریں کھینچ کر آگئے کہ یہ کلام مجید کی انتہائی بے ادبی ہے۔ بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انہیں کچھ عرصہ کے لئے دہلی سے چلے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر شاہ صاحب کی جرأت اور فرض شناسی کامیاب ہوئی۔ انھوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لئے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر تبرک رکھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں، ہم اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں، ان حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں اور اس کے لئے رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا، بلکہ اردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کی راہ پیدا ہو گئی۔

قرآن مجید کا محض ترجمہ کر دینا ہی اس قدر اہم کام تھا کہ اگر شاہ صاحب فقط اسی کا خیر پر اکتفا کرتے اور وہ ابتدائی دشواریاں دور کر دیتے جو عام علماء کی فرض ناشناسی اور کورانہ تقلید کی وجہ سے ان کے راستے میں حائل تھیں، تب بھی اسلامی تاریخ میں ان کا نام درخشاں ستارے کی طرح چمکتا،

شاہ صاحب نے نہ صرف قرآن مجید کا ترجمہ کیا بلکہ اس مسئلے کے علمی پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا اور مقدمہ فی ترجمۃ القرآن میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لئے کارآمد ہدایتیں درج کیں۔

شاہ صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: ”اس بندہ ضعیف پر خداوند تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں، جن میں سب سے زیادہ عظیم الشان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھے قرآن مجید سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات اس کمترین امت پر بہت ہیں، جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے۔“

قرآن مجید کی تبلیغ شاہ صاحب نے فقط ترجمہ کر کے ہی نہیں کی، بلکہ علم تفسیر کے متعلق کتابیں بھی لکھیں، جن میں ”الفوز الکبیر فی اصول التفسیر“ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں، جن میں علوم قرآنی اور مطالعہ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں آپ نے مسئلہ نسخ پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالی ہے اور وہ آیات منسوخہ جن کی تعداد بعض لوگوں کے نزدیک پانچ سو کے قریب تھی اور جن کی تعداد علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی بیس مقرر کی تھی، چار سے زیادہ تسلیم نہیں کیں۔

الفوز الکبیر کے بعض اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحب قرآنی ارشادات کو وسیع دے وسیع مفہوم دینا چاہتے تھے۔ وہ مختلف آیتوں اور سورتوں کے متعلق اسباب نزول کا خیال رکھتے ہیں، لیکن اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے کلام مجید کے اصلی مقصد پر پردہ نہ پڑ جائے۔ چنانچہ باب اول میں لکھتے ہیں: (ترجمہ)

”عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحث کی ہو یا احکام کی، ایک قصے کے ساتھ ربط دیا ہے اور اس قصے کو اس آیت کے لئے سبب نزول مانا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ نزول قرآنی سے مقصود اصلی نفوس بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔ اس لئے آیات مناظرہ کے نزول کے لئے متکلمین میں عقائد باطلہ کا وجود اور آیات احکام کے لئے ان میں اعمال فاسدہ اور مظالم کا شیوع اور

لیکن ان کا ترجمہ بطور خود بلند پایہ اور قابل قدر و عظمت ہے۔ ترجمے کی مخالفت بیشتر تو تقلید اور امور مذہب میں مغز کو چھوڑ کر استخوان کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے تھی، لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے ترجمے میں ہزاروں دقتیں ہیں۔ ترجمے میں لفظی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے یلغ معانی اور اس کی ادبی شان کو اس پر قربان نہ ہونے دینا اس قدر مشکل ہے کہ آج جب کہ ہمیں قرآن مجید کے ترجموں میں دو سو سال کی مشق ہے اور قوم کے بہترین علماء و ادباء نے اس قومی خدمت پر توجہ کی ہے، ایک بھی ترجمہ ایسا نہیں ہے جسے تسلی بخش کہا جاسکے یا جس سے اصل کے زور بیان، فصاحت و بلاغت اور روحانی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ شاہ ولی اللہ کے ترجمے کے متعلق یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا اور اصل میں ضرورت یہ ہے کہ مستند اور بلند پایہ ترجمے کے لئے علماء اور اہل قلم کی ایک پوری جماعت یہ فرض ادا کرے، لیکن اکثر باتوں میں وہ موجودہ اردو ترجموں سے کہیں بہتر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والے میں جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے وہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں جمع نہیں ہوئیں۔ مولانا ذریعہ احمد کہتے ہیں: ”فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لئے جتنی باتیں درکار تھیں ترجمے سے ثابت ہوتا ہے وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ میں علی وجہ الکمال پائی جاتی تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحب کی نظر تفسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہیں کا حصہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیش نظر ہیں اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں اسے اختیار کرتے ہیں۔“

لائے ہیں) محدثین کے نزدیک ان کا اکثر حصہ صحیح نہیں اور ان کے اسناد میں خامیاں ہیں، ان لوگوں کی اس افراط کو علم تفسیر کے لئے شرط سمجھنا صریح غلطی اور اس کے حفظ پر فہم کتاب اللہ کو موقوف کرنا دراصل کتاب اللہ سے اپنا حصہ کھولنا ہے۔“

مفسرین کی یہی ثولیدہ نویسی تھی جس کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے وصیت نامے میں بھی لکھا کہ قرآن اور اس کا ترجمہ تفسیر کے بغیر ختم کرنا چاہئے اور پھر اس کے بعد تفسیر اور وہ بھی تفسیر جلالین (بقدر درس) پڑھائی جائے (جونہایت مختصر ہے اور جس کے الفاظ قرآن کے الفاظ جتنے ہیں) وہ لکھتے ہیں: قرآن عظیم اس طرح پڑھائیں کہ صرف قرآن اور ترجمہ بغیر تفسیر کے (پڑھا جائے) مگر جہاں شان نزول یا قاعدہ نحو مشکل ہو وہاں ٹھہر جائیں اور بحث کریں، بعد اس کے تفسیر جلالین بقدر درس پڑھادیں۔“ (ترجمہ)

(ماخوذ از: ”دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر“)

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سن وفات ۶۳۲ء ہے اور سندہ پر محمد بن قاسم کا حملہ ۲۱ء میں ہوا۔

(۲) بقول علامہ اقبال - شہادت ہے مقصود مطلوب مومن۔ نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

(۳) رستم، سپہ سالار افواج ایران کو اس کے مخبروں نے مسلمان افواج کے جو حالات بتائے تھے ان میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ ”ہم رہبان باللیل و فرسان بالنہار“ یعنی ”وہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار“

(۴) تاریخ اسلام کا یہ دور عجیب ہے کہ از شرق تا غرب غلاموں ہی کی حکومتیں قائم تھیں۔ چنانچہ ہند میں خاندان غلاماں حکمران تھا تو مصر میں مملوک سریر آرائے مملکت تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کو کہاں سے اٹھا کر کہاں تک پہنچایا!

(۵) یعنی ۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر کی وفات تک!

(۶) چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کے آغاز کے نصف ہی صدی کے اندر یہ چراغ بالکل بجھ گیا اور ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد میں وہ قتل عام ہوا کہ الامان والحفیظ اور آخری عباس خلیفہ مستعصم باللہ اس طرح عام

آیات تذکیر کے نزول کے لئے ان کا بغیر ذکر آلاء اللہ وایام اللہ اور موت و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہوا۔ خاص واقعات کو جن کے بیان کرنے کی زحمت اٹھانی گئی ہے، اسباب نزول میں چنداں دخل نہیں۔ مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہوا ہو۔“

الفوز الکبیر کی دوسری خصوصیات شاہ صاحب کی انصاف پسندی اور

اخلاقی جرات ہے۔ مثلاً عام طور پر مسلمان زمانہ جاہلیت کے عربوں سے فقط برائیاں اور عیب ہی منسوب کرتے ہیں، لیکن شاہ صاحب نے اس معاملے میں بھی ”انصاف بالائے طاعت“ کے اصول کو ملحوظ رکھا اور تصویر کے دونوں پہلو پیش کئے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی اصل مذہبی کتاب کو بدل ڈالا ہے، لیکن شاہ ولی اللہ اس کے قائل نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں: ”یہودی تحریف لفظی، تورات کے ترجمے وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل کتاب میں، کیونکہ

تفسیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہوا ہے اور ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔“

بعض مفسرین نے اہل کتاب سے قصے لے کر انہیں قرآنی تفاسیر

اور علوم اسلامی کا جزو بنا دیا ہے۔ اس کے خلاف شاہ صاحب نے جا بجا

آواز بلند کی ہے۔ مثلاً الفوز الکبیر میں لکھا ہے: ”یہاں پر یہ جان لینا

مناسب ہے کہ حضرات انبیاء سابقین کے قصے احادیث میں کم مذکور ہیں

اور ان کے وہ لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام

مفسرین کرتے ہیں، وہ سب الا ماشاء اللہ علماء اہل کتاب سے منقول

ہیں۔“ اسی کتاب میں آگے چل کر پھر لکھتے ہیں: ”اسرائیلی روایات کا نقل

کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہوگئی ہے۔ حالانکہ صحیح

اصول یہ ہے کہ ان کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔“ مفسرین کے بعض قصے

جنہیں عوام اسلام کا ضروری جزو سمجھنے لگ گئے ہیں، شاہ صاحب کو بہت

ناپسند تھے۔ فرماتے تھے: ”اور محمد بن اسحاق واقدی کلبی نے قصہ آفرینی

میں جس قدر افراط کی ہے (یعنی وہ ہر ایک آیت کے تحت میں ایک قصے

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت ادیب اور مشاعر
مہر لعل محمد علی مدنی، رفیقہ دارالمرصفتین، اعظم گڑھ
(۱۵ مئی ۱۹۶۸ء، نومبر ۱۹۶۸ء، ۱۶-۲۱)

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام

بتاریخ ۲۸/۲۹/۳۰ اپریل ۲۰۱۱ء

سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار

بعنوان

”عربی، فارسی، اردو کے فروغ میں

شاہ ولی اللہ کا حصہ“

کے انعقاد پر

ولی مبارکباد

نثار احمد

نائب صدر آل انڈیا کینیڈا، لودھی روڈ،

دہلی دہلی

9810044367

ڈاکٹر عبید العظیم

ایڈووکیٹ

صدر راشٹریہ ایکٹو کاس پریشد

جنرل سکریٹری انڈین آرٹ اینڈ کلچرل گروپ

9891376939

زنج کر دیا گیا جیسے کسی بھیڑ یا بکری کو طال کر دیا جائے۔ جس پر خون کے آنسو
بہائے شیخ سعدی نے۔

آہاں راتن بود گر خون بارود بر زمیں بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین!
اے محمد گر قیامت سر بروں آری ز خاک سر بروں آرد قیامت در میان خلق میں!
(۷) شوکت سبزوئی سلم تیرے جلال کی نمود فقر جنید و بارید تیرا جمال بے نقاب
(۸) گویا علامہ اقبال کا یہ شعر کہ۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ ظلیں خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز
ظاہری طور پر بھی مطابق واقعہ ہے اور معنوی طور پر بھی۔ خصوصی تاریخ اسلام کے اس دور
میں جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے ایک طرف تثلیث کے فرزندوں نے حبیبی جنگوں
سے عالم اسلام کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا اور دوسری طرف یہ معنوی تثلیث
اسلام کی وحدانیت کی جڑیں کھوکھلی کر چکی تھی۔

(۹) حضرت عبداللہ بن المبارک کے اس شعر کی اتنی ہی فصیح و بلیغ ترجمانی کی ہے علامہ
اقبال نے اپنے اس شعر میں

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری اے کشتہ ملائی و سلطانی و پیری!
(۱۰) علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ قرآنی (ان المملوک اذا دخلوا قریۃ
افسودھا وجعلوا اعزۃ اهلها اذلہ) (النمل: ۳۳) کے حوالے سے کس قدر
عمدہ اشعار کہے ہیں:

آ تاؤں تجھ کو رمز آئی ان المملوک سلطنت اقوام غالب کی اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمران کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز دیکھتی ہے حلقہ گردن میں ساز دلبری
سروری زبیا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے حکمران ہے اک وہی باقی بتان آذری

(۱۱) شیخ سعدی کا ایک ترجمہ اب بھی بازار میں ملتا ہے، لیکن شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ
سے اس کی نسبت مشتبه ہے اور یقیناً ترجمہ کبھی بھی راجح نہیں ہوا۔ شاہ صاحب
سے پہلے ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے سلاطین جوینور کے
زمانے میں ایک تفسیر بحر مواج لکھی تھی، جس میں ہر آیت کی تشریح و تفسیر سے پہلے
اس کا ترجمہ دیا تھا، لیکن ظاہر ہے اس ترجمے کی حیثیت محض ضمنی اور جزوی تھی اور
اسے کبھی بھی عام مقبولیت نصیب نہ ہوئی۔

☆☆☆☆☆



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

M/o HRD, Dept. of Higher Education, Govt. of India

Farogh-e-Urdu Bhawan
FC-33/9, Institution Area, Jasola, New Delhi-110025, Ph.:49539000, Fax: 011-49539099,
E-mail: urducouncil@gmail.com

قومی اردو کونسل کی چند اہم مطبوعات

فیض میر

مصنف: میر تقی میر، مترجم: شریف حسین قاسمی

میر تقی میر اردو کے ایک عظیم شاعر تھے انھوں نے فارسی نثر میں بھی کئی رسالے چھپوڑے ہیں۔ فیض میر بھی میر تقی میر کا ایک فارسی رسالہ ہے جس کا ذکر محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں بھی کیا ہے مگر یہ رسالہ تیار نہیں تھا۔ اس کے متن کو پہلی مرتبہ مع اردو خلاصے کے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے نظامی پریس کھنٹو سے شائع کیا تھا۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے اس رسالے کو دوبارہ 1929 میں نسیم بکڈ پبلکیشن سے شائع کیا جس میں انھوں نے ایک اہم اور مفید فرہنگ کا اضافہ کر دیا تھا۔ یہ رسالہ میر نے اپنے بڑے بیٹے فیض علی کو 'نزل' سے آشنا کرانے کے لیے لکھا تھا۔ قومی اردو کونسل کے لیے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے 'فیض میر' کا یہ متن فیض میر کے دستیاب قلمی نسخوں کی مدد سے تیار کیا ہے۔

قیمت: 321 روپے صفحات: 48

لسانیات کیا ہے

مصنف: ڈیوڈ کرسٹل مترجم: نعیم احمد خاں

لسانیات کا بطور علم مطالعہ گزشتہ صدی کے ابتدائی زمانے سے شروع ہوا اور برطانوی یونیورسٹیوں میں اس کو 1960 کے آس پاس ترقی ملی ہے۔ اب لسانیات زبان کی سائنس کے طور پر تقریباً پوری طرح قائم ہو چکی ہے۔ یہ کتاب لسانیات سے ناواقف حضرات کو یہ بتانے کی غرض سے لکھی گئی ہے کہ لسانیات کیا ہے، اور اس کے دائرہ کار میں کیا کیا شامل ہے۔ اس کتاب میں لسانیات اور زبان کے بارے میں راج چندر غلط نہیںوں کو دور کرنے اور زبان کے جدید مطالعے کو بعض پرانے نظریات سے قریب لانے کی کوشش کی گئی ہے اور لسانیات کے مضمرات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت: 421 روپے صفحات: 160

خسر و شاسی

مترجمین: ظان نصاریٰ، ابو الغیث سحر

امیر خسرو دہلوی کی ساتویں صدی سالہ تقریبات کے موقع پر قومی اردو کونسل نے یادگاری مضامین کا یہ مجموعہ شائع کیا تھا جس میں اردو، فارسی اور ہندی کے اہم نقادوں کے 19 مضامین شامل ہیں جو خسرو کے عہد اور فکر و فن پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ مترجمین نے ایک ہمسوا مقدمہ بھی لکھا ہے اور ایک سوانحی جدول بھی شامل کیا ہے۔ امیر خسرو کا عہد وہ ہے جب دہلی کے فارسی گوئیوں میں امیر خسرو، خواجہ حسن دہلوی، صدر الدین عالی، نخل الدین قواسم، ہمدانی، راجہ، مولانا عارف، محمد اکیم اور شہاب الدین و قمر پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں اور یہ تمام خسارے امیر خسرو کے آفتاب کمال کے سامنے بے نور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کتاب امیر خسرو کی شخصیت، فن اور ان کے عہد پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

قیمت: 811 روپے صفحات: 368

سونیا: ایک سوانح

مصنف: رشید قدوائی مترجم: حمید العظیم قدوائی

رشید قدوائی نے ہندوستان کی ایک اہم اور تاریخ ساز شخصیت سونیا گاندھی کی سوانح عمری قلم بند کی ہے جو موجودہ ہندوستانی سیاست کے نقیب و فرما کو سمجھنے کی ایک عمدہ کوشش ہے۔ اس کتاب سے ہندوستان کے جمہوری نظام کی نشوونما کے کئی فکر انگیز پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اسی لیے اس انگریزی کتاب کا پرچہ شائع خیر مقدم کیا گیا اور کئی ہندوستانی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ اردو میں اس کا ترجمہ عبدالعظیم قدوائی نے کیا ہے جس کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس یقین کے ساتھ شائع کیا ہے کہ اردو داں حلقوں میں یہ کتاب پسند کی جائے گی۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے جو سونیا گاندھی کی سیاسی زندگی میں دلچسپی رکھتے ہیں

قیمت: 801 روپے صفحات: 138

تاریخ شیخو سلطان

مصنف: محبت الحسن مترجم: حامد اللہ افسر، شتیق صدیقی

ہندوستان کی جنگ آزادی کے اولین پیروؤں میں شیخو سلطان کا نام بعد اہم ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں اپنے اقتدار کے راستے کا سب سے بڑا پتھر شیخو سلطان کو ٹھکرائی تھی۔ جب ہماری دہلی ریاستیں انتشار اور آفراتفری کا شکار تھیں اس وقت شیخو سلطان کا مسودہ بہترین کارکردگی اور عمدہ حکومت کی تصور پیش کر رہا تھا اور بیرونی طاقتوں کو سینے سے روک رہا تھا۔ شیخو سلطان کی حیات ہندوستان کی آزادی اور تاریخی علامت تھی۔ تاریخ شیخو سلطان میں محبت الحسن نے شیخو سلطان کی شخصیت اور ان کے عہد کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کی قومی تحریکات خصوصاً تحریک آزادی میں دلچسپی رکھنے والے طلباء کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے جس کا اردو ترجمہ حامد اللہ افسر اور شتیق صدیقی نے کیا ہے۔

قیمت: 1151 روپے صفحات: 555

تحریک خلافت

مصنف: محمد عدیل مہاسی

تحریک خلافت کا مطالعہ ہندوستان کی تحریک آزادی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کیونکہ ہندوستان میں تحریک خلافت ہی تھی جس نے مکمل آزادی کے مطالبے کا مجاہدین آزادی کو حوصلہ بخشا اور ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا کیا۔ تحریک خلافت ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اس اجالے میں اپنے آپ کو دکھا اور پالیا۔ اس تحریک سے اس عہد کی ہمیشہ تمام اہم شخصیات وابستہ تھیں۔ اس تحریک پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے قاضی محمد عدیل مہاسی کی یہ کتاب شائع کی ہے جس کی اہمیت اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ محمد عدیل مہاسی خود بھی تحریک خلافت میں شامل تھے۔

قیمت: 671 روپے صفحات: 279

شعبہ مطبوعات: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونک 7، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066، فون۔ 26109746، فیکس۔ 26108159

E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات

مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی

100.00
200.00
250.00
150.00
100.00
200.00
200.00
20.00
20.00
70.00
250.00
300.00
350.00
300.00
300.00
150.00
100.00
100.00

ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی

مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی
"
"
"
"

مولانا جنید احمد بناری

خورشید انوار عارفی

SHAH WALIULLAH INSTITUTE

MASJID KAKA NAGAR, (NEAR NDMC PRIMARY SCHOOL)
KAKA NAGAR, NEW DELHI-110003
PH: 9811740661, TELEFAX: 26953430
E-mail: shahwaliullah_institute@yahoo.in